فلسطین نمبر اور **اقبال نمبر**

کے بعد اب

ہفت روزہ **ندائے خلافت** لاہور کا

عراق نمبر

شائع ہو گیا ہے ' جس میں

اسلام سے قبل عراق کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے علاوہ خلافت عباسیہ کے عہد میں عراق کے عروج' خلافتِ عثمانیہ میں اہلِ عراق کی خدمات' خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر مغربی استعمار کی عیارانہ سازشوں اور خصوصاً امریکہ کی ریشہ دوانیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے علاوہ

جا بجا خاکے' نقشے اور مستند و معتبر اعداد و شمار "**عراق نمبر**"

کو گھریلو ضرورت کی ایک مستقل حوالہ جاتی کتاب بناتے ہیں

اپنی کاپی آج ہی بک کروائیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' 36 کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

20 MAY 2003

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ - مئی ۲۰۰۳ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بخاری شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حرفِ اوّل

عربی بورڈ آف سٹڈیز کی جانب سے ایک عمدہ تجویز!

باوثوق ذرائع کے مطابق حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے بی اے/بی ایس سی کی سطح پر انگریزی زبان بطور لازمی مضمون ختم کرنے کی ایک تجویز پر غور کے لئے ایک 13 رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے جو اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی سفارشات سنڈیکیٹ کو پیش کرے گی ـــــ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گزشتہ سال پنجاب یونیورسٹی کی ''فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ'' کے 5 نومبر 2002ء کے اجلاس میں جو ڈین آف فیکلٹی پروفیسر ڈاکٹر اکرم چوہدری کی زیرصدارت منعقد ہوا' ایک اچھوتی تجویز زیرغور آئی۔ تجویز یہ تھی کہ پنجاب یونیورسٹی میں گریجوایٹس کی سطح پر طلبہ کو ''انگریزی لازمی'' کے بجائے اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ چھ سرکاری زبانوں یعنی عربی' انگریزی' فرانسیسی' روسی' ہسپانوی اور چینی میں سے کوئی ایک زبان پڑھنے کا اختیار دیا جائے ـــــ بعدازاں اس تجویز پر مبنی سفارش یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کو ارسال کی گئی جس نے اس پر مزید غور کیلئے اعلیٰ سطح کی 13 رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے جو اس تجویز کے حسن و قبح پر تفصیلی بحث اور غور و خوض کے بعد اپنی سفارشات حتمی منظوری کے لئے سنڈیکیٹ کو پیش کرے گی۔

بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہمارے شعبہ تعلیم میں چوٹی کی سطح پر لکیر کو پیٹتے رہنے کے انداز میں انگریز کے بنائے ہوئے نظام کو برقرار رکھنے اور اسے تحفظ دینے کے مریضانہ رجحان میں کمی کے آثار ظاہر ہوئے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نظام تعلیم میں ضروری تبدیلیاں لانے کی مثبت سوچ جنم لینے لگی ہے۔ تعلیمی شعبے کی حبس زدہ فضا میں مذکورہ تجویز کو بجا طور پر ہوا کا ایک تازہ اور خوشگوار جھونکا قرار دیا جا سکتا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ یہ تجویز اگر یونیورسٹی کی سطح پر ''منظوری'' کا ہفت خواں طے کرنے میں کامیاب ہوگئی تو یہ آئندہ تعلیم جیسے اہم شعبے میں مزید مثبت اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ فرنگی آقاؤں کے جانے کے بعد ہم نے ان کی زبان کو ''مقدس نشانی'' سمجھتے ہوئے اپنے گلے کا تعویذ بلکہ طوق بنا لیا۔ انگریز کے دور میں چھٹی کلاس سے بی اے تک انگریزی کی تعلیم لازمی تھی۔ ہم نے چار قدم آگے بڑھ کر پہلی جماعت (بلکہ نرسری کلاس) سے بی اے تک اسے لازمی قرار دے دیا۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی اس غیر ملکی زبان کو ہم نے کچھ اس انداز سے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا کہ ''تعلیم'' اور ''انگریزی زبان'' (باقی ٹائٹل صفحہ ۳ پر)

درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۳)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾

تکملۂ مباحث

گزشتہ نشست میں اگرچہ ہماری گفتگو تیسری آیت تک پہنچ گئی تھی لیکن پہلی دونوں آیتوں کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں رہ گئی تھیں۔ آج ہمیں پہلے ان کا قرض ادا کرنا ہے' پھر آگے بڑھنا ہے۔

پہلی آیت مبارکہ جو اِس سورۃ کا ''مطلع'' ہے' اس میں یہ بحث تو مکمل ہوگئی کہ سَبَحَ یَسْبَحُ اور سَبَّحَ یُسَبِّحُ کا لغوی مفہوم کیا ہے اور اللہ کی تسبیح سے کیا مراد ہے۔ پھر یہ کہ یہ تسبیح قولی بھی ہے اور حالی بھی' اور قرآن حکیم میں یہ فعل مضارع میں بھی آئی ہے اور فعل ماضی میں بھی۔ گویا اس کائنات کی ہر شے ہر آن اللہ کی تسبیح کر رہی ہے' ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔ یہ مضمون تو سامنے آ گیا' لیکن غور کرنا ہوگا کہ اس مضمون کی اہمیت کیا ہے۔ اس قدر اہتمام اور شد و مد کے ساتھ پانچ سورتوں کے آغاز میں جو یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

جان لیجئے کہ اصل میں یہ الفاظ حصولِ معرفت ربّ کے ذریعے اور طریقے پر بحث کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' انسان کے لئے اللہ کی معرفت ہی اصل مطلوب و مقصود ہے' جب صحیح معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا ظہور اعمال سے خود بخود ہونا شروع ہو جائے گا اور انسان حق عبادت بھی ادا کر سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معرفت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

اللہ کی معرفت کے حصول کے دو راستے ہیں:

(۱) عقلی اور منطقی راستہ (Rational Approach)

(۲) قلب اور روح کے ذریعے اللہ کو پہچاننا (Mystic Approach)

اگرچہ ہمارے صوفیاء کا اصل میدان تو مؤخر الذکر ذریعہ ہی ہے' لیکن قرآن مجید نے اسے زیادہ نمایاں نہیں کیا' اگرچہ اس کو تسلیم کیا ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے کہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انہیں زیادہ نمایاں کرتا ہے اور بعض سے وہ سرسری طور پر گزرتا ہے۔ اس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور کوئی سبق مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذّٰریٰت: ۲۱) ''اور تمہارے وجود میں بھی (ہماری نشانیاں ہیں)' کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' کبھی اپنے باطن میں جھانکو تو سہی! اقبال نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

حقیقت کا ادراک اور معرفتِ ربّ انسان اپنے باطن سے کر سکتا ہے۔ اسی کے لئے meditation اور مراقبے ہیں۔ صوفیاء نے جو راستے اختیار کئے ان کو قرآن نے اصولاً مانا ہے۔ ایک حدیث' جو اگرچہ محدثین کے نزدیک مستند نہیں ہے' مگر صوفیاء اسے تسلیم کرتے ہیں' اس میں یہ مضمون اس طرح آیا ہے: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ)) ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا''۔ اور قرآن مجید میں یہ مفہوم موجود ہے۔ اسی سلسلہ سور میں یعنی سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں ہے کہ:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۹)

''اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور پھر اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

گویا اللہ کی معرفت کا نتیجہ معرفت نفس ہے۔ اپنے آپ کو بھی انسان تبھی پہچانے گا اگر اللہ کو پہچانے گا۔ اسی کا عکس (Converse) یہ ہے کہ اگر آپ اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اللہ کو پہچانیں گے۔ گویا یہ بات دونوں طرف سے صحیح ہے۔ اس لئے کہ روحِ انسانی کا ذاتِ باری تعالیٰ سے ایک خاص ربط و تعلق ہے جس کے لئے قریب ترین تمثیل یا تشبیہہ یہ ہے کہ سورج اور اس کی شعاعیں کروڑوں میل کا سفر کر کے زمین تک پہنچ رہی ہیں' بلکہ آگے بھی نامعلوم کہاں تک جاتی ہیں' لیکن ہر شعاع کا تعلق سورج کے ساتھ برقرار ہے۔ تو ارواحِ انسانیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک ربط و تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ گویا اللہ کو پہچاننے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی روح کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں غور و فکر کرے۔ تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید میں معرفت ربّ کے عقلی و منطقی ذریعے کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لیکن پھر استدلال اور منطق کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) استخراجی منطق (Deductive Logic): اس میں آدمی ایک ایک قدم آگے بڑھا کر دلیل کے حوالے سے فہم و شعور حاصل کرتا ہے۔

۲) استقرائی منطق (Inductive Logic): اس میں انسان کائنات میں موجود تنوع کے بارے میں اپنے مشاہدات جمع کرتا ہے اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے induction ہی کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہر شے کو اللہ کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں پوری تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱٦٤)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ استقراء ہے۔ اقبال نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ہمارے متکلمین اور فلاسفہ کا طریقہ استخراجی منطق (Deductive Logic) کا تھا اور اب اس کا دور گزر چکا۔ چونکہ سائنس کی بنیاد بھی استقراء (induction) ہے لہٰذا اسی کے حوالے سے اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ ''عہد حاضر کے سائنٹیفک کلچر کا Inner Core قرآنی ہے''۔ اس لئے کہ قرآن مشاہدے کی دعوت دیتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۞ وَاِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ ۞ وَاِلَی الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ ۞ وَاِلَی الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ ۞﴾ (الغاشیۃ:۱۷۔۲۰)

''بھلا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

یہ تمام اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان مشاہدات کے ذریعے معرفتِ ربّ حاصل کرو۔ قرآن مجید میں اصل زور آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کے مشاہدے پر ہے:

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔''

اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد Scientific Era شروع ہونے والا تھا۔ (سائنس کی موجودہ ترقی کوئی بہت قدیم نہیں ہے' بلکہ دو تین سو برس کے اندر ہی یہ بہت بڑا دھماکہ ہوا ہے) ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اس سائنسی دَور کا فاتح ہے کہ اس نے انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسراء یل:۳۶)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ' کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

یعنی تم اپنے موقف کی بنیاد توہمات پر نہ رکھو' بلکہ عقل سے استدلال کرو' سمع و بصر سے کام لو اور نتیجہ اخذ کرو۔ قرآن مجید میں اس پر جو زور دیا گیا ہے' وہ دو وجوہ سے ہے:

۱) عرب جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے' ان کا ذوق منطقی اور فلسفیانہ نہیں تھا۔ وہ ایک اُمّی قوم تھی' جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ قوتِ کار اور قوتِ کردار کے مالک تھے۔ خاص طور پر مکہ کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ جب تک کوئی دشمن تھا تو جانی دشمن تھا' لیکن جب کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا تھا تو وہی 'وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ''بن جاتا تھا۔ ان کے یہاں کسی قسم کی منافقت نہیں تھی' بلکہ کردار کی بڑی پختگی تھی کہ جو کہہ رہے ہیں وہی کر رہے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ اور منطق ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس حوالے سے بھی قرآن مجید نے Inductive Logic کو نمایاں کیا' اور اس اعتبار سے بھی کہ اب Scientific Era کا آغاز ہونا تھا۔

بہرحال قرآن کا ایک اسلوب وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ ہر شے اللہ کی نشانی ہے' اسے دیکھو اور اس کے ذریعے اللہ کو پہچانو ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرے ہوشیار
ہر ورق دفتر است از معرفت کردگار

گویا درخت کا ہر پتا اللہ کی معرفت کا دفتر ہے۔ اسی مضمون کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود سے اپنے خالق اور صانع اور موجد کے ایک ہستی کامل ہونے کا اعتراف اور اقرار و اعلان کر رہا ہے اور اسی کے ذریعے سے تم اللہ کی معرفت حاصل کر سکو گے۔ یہ ہے اس مضمون کی اہمیت جو اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بیان ہوا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

دوسری آیت کے مرکزی مضمون (اللہ تعالیٰ کے اختیار و اقتدار) پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ بات دوبارہ نوٹ کر لیجئے کہ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ پہلی آیت کا اختتام ہوا: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہ غالب' حکمت والا ہے''۔ پھر یہ الفاظ ان آیات میں دو مرتبہ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے''۔ اس کے علاوہ آج ہم پڑھیں گے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر متمکن ہوا''۔ یعنی اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ کہیں الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ گیا کہ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو' جیسا کہ بعض فلاسفہ کا خیال ہے' بلکہ وہی ہے جو تخت حکومت پر متمکن ہے۔ ان چھ آیات کے اندر چار مرتبہ emphasise کیا گیا کہ اس کائنات کا شہنشاہ مطلق اللہ ہے اور پوری کائنات میں اسی کی حکومت بالفعل قائم

ہے۔اس وسیع وعریض کائنات کے ایک گوشے میں موجود انسانی زندگی کی اس کائنات کے ساتھ کیا نسبت تناسب بنے گی؟ اور اس میں بھی انسان کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ ہے جس میں اسے آزادی (Free Will) دی گئی ہے۔ اور اس ہلدی کی گانٹھ کو لے کر آدمی حاکم (sovereign) بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر بغاوت کرتا ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ.....﴾ (الروم:۴۱)

''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔''

اور درحقیقت اس سورۂ مبارکہ میں جو زور دے کر کہا جا رہا ہے کہ لگا دو' خرچ کر دو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں' تو کس کام کے لئے؟ تاکہ اللہ کی حکومت قائم کی جائے! جسے بائبل کی Lord,s Prayer میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

Thy Kingdom come,
Thy will be done on earth
as it is in Heavens.

یعنی اے ربّ! تیری مرضی جس طرح آسمانوں میں نافذ ہے اسی طرح زمین پر بھی تیری حکومت قائم ہو جائے! یہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہے' اسی کا نام اقامت دین ہے' اسی کا نام غلبہ دین حق ہے' اسی کا نام تکبیر ربّ ہے۔ان سورتوں میں سارا زور اسی پر ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ اللہ کے دین کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔ یہی مقصد بعثت محمدیؐ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے (نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا) جس کے لئے تمام رسول بھیجے گئے۔اب ظاہر ہے اس کے لئے جان کھپانی ہو گی' مال خرچ کرنا ہو گا' وقت پڑنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہو گا اور گردنیں کٹوانی ہوں گی۔

تیسری آیت: مشکل ترین مقام

اب آیئے تیسری آیت کی طرف۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ فلسفہ وجود سے بحث کرتی ہے جو کہ فلسفے کا مشکل ترین موضوع ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں بنیادی طور پر سمجھ لیجئے۔

ایک یہ کہ قرآن دقیق فلسفیانہ مسائل ضمنی طور پر زیر بحث لاتا ہے اور ان پر زیادہ بحث نہیں کرتا' لیکن لاتا ضرور ہے۔ اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہی بات جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب امّی تھے' لیکن رسول اکرم ﷺ کی بعثت تو پوری نوع انسانی کے لئے ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ اور نہ صرف آپؐ اپنے دور کے تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے بلکہ تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کا دورِ رسالت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان میں ہر طرح کے آدمی ہیں۔ عوام بھی ہیں' خواص بھی ہیں' جاہل بھی ہیں' علماء بھی ہیں' فضلاء بھی ہیں' فلاسفہ بھی ہیں' ہر ذہنی سطح کے لوگ ملیں گے' ہر طرح کی تہذیب اور تمدن سے واسطہ پڑے گا۔ ان سب کی طرف رسالت محمدیؐ کی بعثت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ پہلے ایک قوم کا انتخاب کیا اور اس کے ذہن' فکر' عمل اور اخلاق و کردار کے اندر ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور اسے instrument بنایا کہ اب بقیہ نوع انسانی تک یہ پیغامِ رسالت تم پہنچاؤ۔ اس میں ظاہر ہے کہ پہلی مخاطب قوم کی ذہنی سطح کو اگر ملحوظ نہ رکھا جاتا تو یہ پیغام خود اس قوم کی ذہنی سطح سے بالاتر رہتا۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا بڑا حصہ اُس قوم کے عقل و شعور کی سطح کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن حکیم ہمیشہ کے لئے ہدایت ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پوری نوع انسانی کے لئے ہے جس میں علماء و حکماء بھی ہوں گے لہٰذا قرآن حکیم دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی touch کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں کو بھی تو آخر ہدایت یہیں سے نصیب ہونی تھی' بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر کی فکری پیاس بھی آخر اسی چشمۂ حیواں سے بجھنی تھی' جس نے کہا کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

مشرق ومغرب کے سارے فلسفے کھنگالنے کے بعد علامہ اقبال کو اگر آسودگی میسر آئی اور اگر سکون نصیب ہوا تو قرآن مجید کے دامن میں۔ چنانچہ اپنے فلسفہ خودی کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ فلسفہ قرآن سے اخذ کیا ہے۔ سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ آپ کے اس فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے اور اس اعتبار سے آپ کس مغربی فلسفی کے خوشہ چین ہیں؟ تو علامہ نے ان سے فرمایا کہ کل فلاں وقت آ جانا' میں تمہیں لکھوا دوں گا۔ سید نذیر نیازی یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں میں بہت خوش تھا کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ شاعر مشرق مجھے اپنے فلسفہ خودی کا source لکھوائیں گے۔ لیکن جب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے تو اقبال نے کہا کہ قرآن مجید نکال لو اور سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ کھول کر کہنے لگے کہ میرے فلسفہ خودی کا ماخذ یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾

''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

تو قرآن مجید میں یہ چیزیں بھی موجود ہیں' لیکن ضمنی طور پر آئی ہیں' اس طور سے کہ اس زمانے کا عرب اسے پڑھتے ہوئے ذرا سا تو ٹھٹکے' لیکن اس سے کوئی مفہوم اخذ کر کے آگے نکل جائے' رک نہ جائے بلکہ گزر جائے۔ البتہ کوئی ایسا شخص جس کے ذہن میں فلسفیانہ مسائل ہوں گے وہ جب آئے گا تو رک جائے گا کہ جا ایں جاست! یہ ہے اصل جگہ۔ وہ اس مقام پر غور کرے گا اور اس کی ہدایت اسے وہاں سے مل جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جو خود فلسفی وحکیم ہے اسے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کے لئے تو اشارہ کافی ہے' اس کو راہنمائی کے لئے چند الفاظ مل گئے تو اس کی الجھن حل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل قرآن مجید میں موجود تو ہیں' لیکن اس طرح کہ جن لوگوں کا مزاج فلسفیانہ نہیں وہ وہاں سے گزر جائیں گے' لیکن جن کے ذہن میں سوالات ہیں وہ وہاں رک جائیں گے۔ اب امام رازی' جو بہت بڑے منطقی' فلسفی اور متکلم ہیں وہ اس

مقام پر رک گئے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہتے ہوئے تھر تھر کانپ رہے ہوں:

اعلم ان ھذا المقام مقام غامضٌ عمیقٌ مھیبٌ

''جان لو کہ یہ مقام بڑا عمیق اور گہرا مقام ہے' بڑا پُر ہیبت مقام ہے!''

اور آج کے دور میں مثلاً مولانا اصلاحی صاحب یہاں سے ایسے گزر گئے جیسے یہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ اپنی تفسیر کے اندر وہ حدیث کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ ان کا اپنا ذوق اور مزاج تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے۔ چنانچہ بعض معاملات میں تو انہوں نے متفق علیہ احادیث کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا اور اٹھا کر پھینک دیا—— لیکن یہاں صرف ایک حدیث کا سہارا لے کر گزر گئے جیسے اس آیہ مبارکہ میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بہر حال یہ اصولی بات ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں دقیق فلسفیانہ مسائل پر مفصل بحث نہیں ہوتی بلکہ صرف اشارہ ہوتا ہے۔

فلسفہ وجود اور اس کی مختلف تعبیرات

یہ بات خاص طور پر یہ نوٹ کیجئے کہ فلسفہ وجود فلسفے کا دقیق ترین مسئلہ ہے' اور اس کے بارے میں مجھے قطعاً یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فلسفے کا طالب علم ہوں' نہ یہ میرا مقام ہے کہ میں اس پر authoritative انداز میں کوئی گفتگو کر سکوں' لیکن اس کے باوجود میں اس پر کیوں گفتگو کرتا ہوں' اسے سمجھ لیجئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر واسلاف میں سے بہت سے حضرات وحدت الوجود کے قائل ہیں اور عام اہل مذہب کی جو ذہنی سطح ہے وہ وحدت الوجود کو کفر سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا dilemma پیدا ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ابن عربی کو تو خیر چھوڑ دیجئے کہ ان کی حیثیت کسی مفسر' محدث یا فقیہہ کی نہیں ہے' اگرچہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جو ان کے سب سے بڑے ناقد ہیں اور ان کے فلسفے کے جواب میں انہوں نے وحدت الشہود کے نام سے فلسفہ پیش کیا ہے' وہ ابن عربی کے مقام کے زبردست قائل ہیں۔ وہ اپنے مکتوبات کے اندر یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انہیں (اپنے کشف کے ذریعے) خاصانِ خداوند کے اندر دیکھتا ہوں۔ اور ایک جگہ یہ الفاظ آئے

ہیں کہ ''مازلّہ بردارِ خوانِ ایشانم..... کہ میں تو ان کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں' لیکن چونکہ معاملہ صفاتِ باری تعالیٰ کا ہے اور مجھے ان سے اختلاف ہے لہٰذا میں اپنا اختلاف پیش کرنے پر مجبور ہوں''۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابن عربی سے سوءِ ظن ہو' کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوتا' لیکن شاہ ولی اللہؒ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مضل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری اور بہت بڑی بڑی شخصیات وحدت الوجود کی قائل ہیں۔ اس حوالے سے میں اپنے درس میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ کم سے کم اس درجے تک بات واضح ہو جائے کہ ان حضرات سے سوءِ ظن نہ رہے۔ کوئی فلسفہ ہے' اس سے آپ اختلاف کریں' آپ کو بڑے سے بڑے انسان سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے' لیکن یہ سمجھنا کہ وہ گمراہی اور کفر کے اندر مبتلا ہو گئے (معاذ اللہ) بہت بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو پھر ہمارے لئے اپنے اسلاف میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ اس حوالے سے میں اس موضوع پر گفتگو کیا کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ موضوع بہت مشکل ہے اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ خود مجھ پر ایک دہشت کی کیفیت ہے کہ میں اسے بیان کر سکوں گا یا نہیں!

میں اس مسئلہ کو پہلے کچھ مقدمات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک خالق کی ایک ہستی کا تعلق ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے' یہ فطرتِ انسانی کے اندر نقش ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (ابراھیم: ۱۰) ''کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟'' معلوم ہوا کہ خدا کو ماننا کہ کوئی خالق ہستی موجود ہے' یہ گویا فطرت انسانی کے اندر پہلے سے نقش ہے' اسے ہر انسان مانتا ہے چاہے اسے کوئی نام دے دے۔

Call the rose by any name, it will smell as sweet.

اس ضمن میں عوامی سطح پر لوگوں کی گمراہی یہ رہی ہے کہ جب وہ خالق کی ہستی کا قیاس

کرتے ہیں تو اپنے بڑے سے بڑے انسان کے تصور سے اوپر نہیں جا سکتے۔ مثلاً کوئی بہت بڑا شہنشاہ ہے تو اس کے بھی کچھ نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس نے انہیں کچھ نہ کچھ اختیارات دیئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑی سے بڑی شخصیت کے کچھ لاڈلے اور پیارے ہوتے ہیں جن کی بات وہ ردّ نہیں کر سکتا۔ یہ تصورات انسان نے اپنے ذہن کے حوالے سے اُس خالق کے ساتھ بھی چسپاں کر دیئے ہیں کہ اللہ تو وہ ہے' لیکن آلِھَة بھی ہیں' چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں۔ ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے لیکن دیوتا اور دیویاں بھی ہیں جنہیں اس نے اختیارات دے رکھے ہیں' اس لئے کچھ بندگی اور ڈنڈوت ان کی بھی کرو تا کہ وہ بھی راضی ہو جائیں۔ دیوی دیوتاؤں کا تصور اصل میں ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ ملائکہ نورانی مخلوق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ ﴿یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ ''وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔ قرآن مجید میں حضرت جبرائیلؑ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِكَ ۚ﴾ (مریم: ٦٤)

''جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے (یعنی ہمارا اپنا وجود) ہر چیز کا مالک وہی ہے''۔

تو یہ اپنے وجود کے بھی مالک نہیں ہیں' یہ بھی اللہ کے اختیارِ مطلق میں ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ تصور جس نے ہمیں شرک سے بچا لیا' ورنہ اتنی برگزیدہ ہستیوں کو صاحب اختیار سمجھا جا سکتا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت جبرائیلؑ کی شان میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ﴾ (النجم: ٥'٦)

''ان (محمد ﷺ) کو زبردست قوت والے (جبرئیلؑ) نے تعلیم دی ہے' جو بڑا صاحب حکمت ہے''۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ۝﴾ (التکویر: ١٩۔٢٠)

''یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر (جبرئیلؑ) کا قول ہے جو بڑی طاقت کا مالک ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے''۔

اگر ہمارے پاس ان کے اختیار کے بارے میں واضح تعلیمات نہ ہوتیں تو ہم بھی انہیں دیوتا مان سکتے تھے' اور فرشتوں کے بارے میں یہی کچھ ان تمام مذاہب میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس آفاقی کائنات کے کارندے ہیں لیکن ان کا اختیار کوئی نہیں ہے' یہ وہی کچھ کرتے ہیں جن کا حکم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن مشرکین نے یہ تصور قائم کیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور عیسائیوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ حضرت مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس قسم کے تصورات سے شفاعت باطلہ کا تصور پیدا ہوا۔ چنانچہ اس عوامی سطح پر توحید اور معرفت ربّ کے ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ واضح کر دیا جائے کہ حاکم مطلق اللہ ہے اور اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے' اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا' وہی تنہا معبودِ حقیقی ہے۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

اس سے ذرا بلند تر سطح پر آیئے تو وہی اللہ تمہارا مطلوب و مقصود ہونا چاہئے۔ ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ مطلوب اور مقصود کے درجے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ گویا لا الٰہ الا اللہ ہی کی تعبیر ہے: **لا معبودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مقصودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلاَّ اللّٰہ'** اور **لا محبوب اِلاَّ اللّٰہ**۔ یہ ہے عوامی سطح پر توحید کا تصور۔ جو انسان یہاں تک پہنچ گیا اس کی توحید کامل ہو گئی۔

ایک اس سے بلند تر سطح ہے جس پر آ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق کو تو ہم نے مان لیا لیکن اس خالق اور مخلوق (کائنات) میں نسبت کیا ہے؟ یعنی اسے دو حصّوں میں تقسیم کر لیجئے۔

۱) خالق نے اس مخلوق کو کیسے پیدا کیا؟

۲) اب خالق و مخلوق کے درمیان کیا ربط ہے؟ جسے فلسفیانہ اصطلاح میں ''ربط الحادث

بالقدیم'' کہا جاتا ہے۔اس قدیم (اللہ) اور حادث (کائنات) میں ربط کیا ہے؟

یہ ہے فلسفۂ وجود کا وہ مسئلہ جس کے اعتبار سے مختلف مکاتیب فکر پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں دو بڑے نظریئے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' مشہور ہیں۔لیکن اس سے پہلے جو بڑی گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں اور انسان نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ان کو سمجھ لیجئے۔ایک تصور ہندو فلاسفی میں یہ دیا گیا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسا ہی ربط ہے جیسے ایک بڑھئی میز بنا دیتا ہے' لیکن بڑھئی کو میز بنانے کے لئے پہلے لکڑی درکار ہے۔یعنی پہلے مادۂ تخلیق موجود ہوگا تب ہی خالق اس سے کوئی چیز بنائے گا۔اب خالق تو ہے پرماتما' جس نے یہ کائنات تخلیق کی' لیکن مادہ بھی پہلے سے موجود تھا۔چنانچہ ان کے ہاں مادہ بھی قدیم ہے اور خدا بھی۔گویا اب یہ ثنویت ہوگئی کہ خدا اور مادہ (matter) دونوں قدیم ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کا ایک اور سکول آف تھاٹ ہے جو تین کو قدیم مانتا ہے' یعنی خدا بھی قدیم' مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ظاہر بات ہے کہ یہ تو بدترین شرک ہے' ہم اس کے بارے میں مزید گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔یہ ''تعددِ قدماء'' کے تصورات کہلاتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کے مابین ربط و تعلق کی ایک دوسری شکل بعض لوگوں نے یہ تجویز کی ہے کہ درحقیقت خدا ہی نے اس کائنات کا روپ دھار لیا ہے' جیسے برف پگھل جائے تو پانی بن جاتا ہے۔اب آپ کہیں کہ پانی کہاں سے آیا اور برف کہاں گئی؟ تو دراصل برف ہی پانی ہے اور پانی ہی برف ہے۔چنانچہ اس نظریئے کی رو سے یہ کائنات ہی خدا ہے۔جب خدا ہی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے تو گویا ہر شے خدا ہے اور ہر شے الوہیت کی حامل ہے۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؟ یہ ہمہ اوست یا Pantheism کا نظریہ ہے۔

اب اس سے بھی آگے نکل آیئے۔اگر یہ کہا جائے کہ خالق و مخلوق کے درمیان ساری نسبتیں جو ہماری عقل میں آ رہی ہیں یہ قابل قبول نہیں ہیں تو پھر ایک ہی وجود ماننا

پڑتا ہے جو خالق کا وجود ہے۔ اس نظریہ کو ''توحید وجودی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین تعبیر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''الدّین القیم'' میں کی ہے' جو اس آیۂ مبارکہ کی بہترین تعبیر ہے' کہ خالق اور مخلوق میں نسبت کو یوں سمجھو کہ کسی شے کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرو۔ فرض کریں آپ نے تاج محل دیکھا ہے' اب آپ تاج محل کا تصور اپنے ذہن میں لائیے۔ آپ کے ذہن میں یہ تصور آپ کی توجہ سے قائم ہے۔ جب تک آپ کی توجہ مرکوز رہے گی یہ تصور ذہن میں رہے گا' جیسے ہی توجہ ہٹے گی اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا' وہ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ جو آپ کی ذہنی تخلیق ہے' آپ ہی اس کے نیچے بھی ہیں' اوپر بھی' اوّل بھی اور آخر بھی۔ اس کا اپنا تو کوئی وجود ہے ہی نہیں' وجود تو درحقیقت آپ کا ہے' یہ آپ کا ایک تصور ہے جو آپ نے اپنے ذہن کے اندر تخلیق کیا ہے۔ بالکل یہی تعلق ہے اس کائنات اور خالق کا۔ یہ کائنات کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ گویا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب اسی ''توحید وجودی'' کی ایک تعبیر شیخ احمد سرہندیؒ نے کی ہے۔ انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے واضح کیا ہے کہ یہ کائنات ہمیں نظر تو آ رہی ہے لیکن حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہے' وجود ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ آپ ایک لکڑی لے کر اگر اس کے ایک سرے پر کوئی کپڑا باندھ دیں اور مٹی کا تیل ڈال کر دیا سلائی سے آگ لگا دیں تو اب ایک مشعل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ایک دائرے میں تیزی سے حرکت دیجئے تو دیکھنے والے کو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا' جب کہ دائرے کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے ' نہیں ہے!

وجود تو صرف اس ایک شعلہ جوالہ کا ہے' باقی حرکت کی وجہ سے بہت کچھ نظر آ رہا ہے جو فی الواقع موجود نہیں ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ؎

کُلُّ مَا فِی الْکَوْنِ وَھْمٌ اَوْ خَیَالٌ
اَوْ عُکُوْسٌ فِی الْمَرَایَا اَوْ ظِلَالٌ

یعنی ''اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اتنی ہے جیسے سائے ہوتے ہیں یا جیسے آئینہ میں عکس ہوتا ہے''۔

وجود تو اُس شے کا ہے جس کا عکس ہے' خود عکس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود ہے۔ اس میں یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ کائنات جو نظر آ رہی ہے حقیقی وجود کی حامل نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے!

تو یہ کائنات درحقیقت اللہ کا تصور ہے' جو بڑا ٹھوس تصور ہے' جبکہ ہمارا تصور تو ایک ہوائی سا تصور ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے مابین نسبت کی یہ بہترین تعبیر ہوگی۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اس کائنات کا اوّل بھی' آخر بھی' ظاہر بھی' باطن بھی وہی ہے۔

توحید وجودی کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے' جو ابن عربی کی ہے۔ اور یہ بہت زیادہ دقیق تعبیر ہے' اس لئے کہ patheism اور ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود میں بہت باریک فرق ہے' جسے عام انسان کے لئے ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خالق اور کائنات کا وجود تو ایک ہی ہے' ماہیت کے اعتبار سے کائنات عین وجود ہے' لیکن جہاں تعین ہو جاتا ہے وہاں وہ غیر ہے۔ جیسے سائنس آج ہمیں بتاتی ہے کہ تمام اجسام atoms کے بنے ہوئے ہیں۔ atoms سے مالیکیول بنے ہیں اور ان سے مختلف چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ایٹم کی مزید تقسیم کریں تو electrons اور protons ہیں' پھر اس سے بھی چھوٹے photons ہیں۔ اور حقیقت میں تو کچھ ہے ہی نہیں' صرف electric currents ہیں۔ انہی electric currents نے جو خاص شکل اختیار کی تو وہ شے وجود میں آ گئی۔ آپ کو یہ ہال خالی نظر آ رہا ہے مگر یہ خالی تو نہیں ہے' اس میں ہوا ہے' جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ملغوبہ ہے اور اس کے اندر وہ سارے ایٹم لطیف صورت میں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں مختلف

formations میں ایٹم موجود ہیں۔ چنانچہ ماہیت کے اعتبار سے اس گھڑی اور عینک میں کوئی فرق نہیں' یہ انہی ایٹموں کی مختلف تراکیب ہیں۔لیکن جب ایک خاص فارمولے کے تحت conglomeration of atoms نے یہ شکل اختیار کی تو یہ ایک دوسرے کا غیر ہیں۔لہٰذا جہاں کسی وجود یا کسی ہستی کا تعین آ گیا وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا غیر ہے' اس کا جزو نہیں ہے' لیکن ماہیت وجود مشترک ہے۔کل کائنات کے اندر وجود ایک ہی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ اس کو کہا گیا ہے ''وحدت الوجود''یعنی وجود کا ایک ہونا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں' ان کے مابین قریباً سو سال کا فرق ہے۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس ضمن میں جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریۂ وحدت الشہود کے مابین صرف تعبیر کا فرق ہے' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔اور اسے خود شاہ صاحبؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا ہے۔یعنی وجود حقیقی ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا ہے' لیکن جہاں کسی شے کا علیحدہ تشخص ہو گیا وہ اللہ کا غیر ہے' وہ خدا نہیں ہے۔تاہم ماہیت وجود خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ ہے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نظریہ جسے شاہ ولی اللہؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا اور اسی کی تعبیر'' **لا معبودَ الاَّ اللّٰہ** ''اور بلند تر سطح پر'' **لا مقصودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلاَّ اللّٰہ'** اور **لا محبوبَ اِلاَّ اللّٰہ**'' ہے۔مزید اوپر جا کر اسی کی تعبیر'' **لا موجودَ اِلاَّ اللّٰہ** '' سے کی جاتی ہے۔یعنی اللہ کے سوا وجودِ حقیقی اور کسی کا نہیں' وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ البتہ جیسے سمندر کے اوپر بننے والی لہریں اگرچہ الگ نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ سمندر ہی کا حصہ ہیں' اسی طرح وجود بسیط خالق اور مخلوق کے درمیان مشترک ہے' البتہ جب کوئی وجود معین ہو کر کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہ خالق کا غیر ہوتا ہے۔ یہاں یہ شے ہمہ اوست اور pantheism سے الگ ہو جاتی ہے۔اس فرق کو ملحوظ رکھئے' اس کے

بعد جی میں آئے تو آپ اس نظریے کو اٹھا کر پھینک دیں' آپ کو وہ نا قابل قبول نظر آئے تو بالکل ٹھکرا دیں۔ ہمیں بڑے سے بڑے شخص سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اختلاف نہیں کر سکتے تو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں کر سکتے' باقی ہر شخص سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ جن لوگوں نے اس کو مانا ہے ان کی توہین نہ ہو' ان کے بارے میں یہ سوئے ظن نہ ہو کہ (معاذ اللہ) وہ ہمہ اوست اور pantheism کے قائل ہیں اور وہ مشرک ہو گئے' گمراہ ہو گئے۔

فلسفۂ وجود کے یہ جو دو shades ہیں جن میں وحدت کا معاملہ ہے' ان کے ضمن میں ہندوستان کے مکاتب فلسفہ میں شنکراچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور ایک فلسفی رامانُجھ وحدت الشہود کا قائل تھا۔ فلسفۂ وجود کی یہی دو interpertations ہو سکتی ہیں' حقیقت میں بات ایک ہی ہے کہ وجود صرف اللہ کا ہے' باقی کوئی شے وجودِ حقیقی کی حامل نہیں۔ یا یہ کہئے کہ ماہیت وجود کے اعتبار سے مخلوق کو خالق کے ساتھ قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے' لیکن تعین کے اعتبار سے وہ خدا کا غیر ہے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

بانی تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** مدظلہ کی تالیف

ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک

تنزل اور ارتقاء کے مراحل

☆ قیمت: ۲۴ روپے ☆ عمدہ طباعت ☆ صفحات ۶۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

قرآن حکیم اور ہم

تحریر: حافظ محمد آصف احسان عبدالباقی

کتاب ہدایت یعنی قرآن حکیم اپنی جلالت قدر اور عظمت شان کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم ترین نعمت ہے جس کا وجود انسانیت کے لئے باعث راحت و رحمت ہے۔ اگرچہ تورات اور انجیل وغیرہ بھی الہامی کتب ہیں لیکن یہ امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایام کے ساتھ کئی قسم کی لفظی و معنوی تحریفوں کا شکار ہو چکی ہیں' جبکہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ یہ ہر قسم کی کمی و بیشی سے یکسر محفوظ و مامون ہے' کیونکہ جس ذات پاک نے اسے نازل کیا ہے وہی اس کی حفاظت وصیانت کی بھی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

''بلاشبہ یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں''۔

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (فُصّلت:۴۱'۴۲)

''یقیناً جن لوگوں نے نصیحت کو نہ مانا جب وہ ان کے پاس آئی' اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے' اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ دانا اور خوبیوں والے (خدا) کی اتاری ہوئی ہے''۔

قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ ایک عظیم گنجینۂ حکمت کی امین ہیں۔ ان میں اسرار و رموز اور معارف و نکات کے اَن گنت خزانے پوشیدہ ہیں جو صدیوں سے متلاشیان حق کے قلوب و اذہان کو اپنے تابش نور سے جلا بخش رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اقرار کر کے شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے والے افراد کے لئے تو قرآن پاک سراسر شفاء ہے۔ سینوں میں پنہاں روگ اور افکار میں مضمر

امراض اس کی سریع الاثر تاثیر سے بالکلیہ زائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (یونس:۵۷)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت آ چکی ہے''۔

اور فرمایا:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ (الاسراء:۸۲)

''اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے''۔

اور فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی ؕ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ﴾ (فصلت:٤٤)

''کہہ دو کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اُن کے لئے یہ ہدایت اور شفاء ہے اور جو ایمان نہیں لاتے اُن کے لئے کانوں میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے اور یہ اُن کے حق میں اندھے پن کا موجب ہے گویا کہ انہیں دُور جگہ سے آواز دی جاتی ہے''۔

قرآن پاک کے لاتعداد فضائل ومناقب کے باوجود یہ ایک افسوس ناک اور غم انگیز حقیقت ہے کہ اس پاک کتاب کے احکام وفرامین سے ہر دَور میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر روگردانی کی روش اختیار کی گئی اور اس کے حقوق وفرائض کی ادائیگی سے اجتناب برتا گیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اہل ایمان کا یوں تذکرہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر:۲۹)

''بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس

تجارت کے فائدے کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی''۔

اور فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۲۱)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں' اور جو اسے نہیں مانتے وہ خسارا پانے والے ہیں''۔

لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ سوائے چند افراد کے اکثریت اسے محض ایک خیر و برکت والی کتاب ہی سمجھتی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا تو درکنار' مجرد تلاوت کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ قرآن پاک کے ساتھ ہمارے قابل افسوس طرزِ عمل کی ایک ہلکی سی جھلک مولانا ماہر القادریؒ کے ان اشعار سے مترشح ہے۔

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں' آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں' دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جزدان حریر و ریشم کے' اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے' خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جس طرح سے طوطا مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں' اس طرح سکھایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لئے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے' ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں
دل سوز سے خالی رہتے ہیں' آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اِک اِک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے' سچائی سے بڑھ کر دھوکہ ہے
اِک بار ہنسایا جاتا ہوں' سو بار رلایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں مجھ کو بار نہیں، کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں!

ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کے حقوق کے ذیل میں بحیثیت مجموعی ہم پر تین امور کی بجا آوری لازم ہے، جو کہ حسب ذیل ہیں:

۱) تلاوتِ قرآن
۲) فہم قرآن
۳) قرآن پر عمل

یہ تینوں حقوقِ قرآن اس وقت مختلف تناسب سے اُمت مسلمہ میں رائج ہیں۔ اگرچہ ان تینوں کی اہمیت وافادیت یکساں حیثیت کی حامل ہے اور ان سب کی ادائیگی کا ایک ہی معیار سے اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اس میں بھی ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ کچھ لوگ اگر تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں تو باقی دونوں پہلوؤں یعنی ''فہم قرآن'' اور ''قرآن پر عمل'' سے یکسر بے پروا ہیں اور چند افراد اگر فہم قرآن پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو صرف اس تک ہی محدود ہیں، قرآن پر عمل اور اس کے احکام کی بجا آوری کی انہیں کوئی فکر نہیں۔ ان سب کے برعکس جو لوگ مطلق طور پر قرآن حکیم پر عمل کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں صبح وشام اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں وہ اپنے فعل میں منفرد اور ریاضت میں یکتا ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن پاک کا اصل حق اس پر عمل کرنا ہی ہے ''تلاوتِ قرآن'' اور ''فہم قرآن'' اسی کے ذیل میں آ جاتے ہیں، کیونکہ جو بندگانِ خدا قرآن پاک کے احکام بجا لانے والے اور اس کی ہدایات پر سرِ تسلیم خم کر دینے والے ہوں گے وہ لامحالہ اس کی تلاوت سے بھی فیض یاب ہوتے ہوں گے اور اس کے فہم سے بھی اپنے دامن علم کو سیراب کرتے ہوں گے۔ پس ہر طرح کی حمد وثنائے سرمدی اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔

قرآن حکیم سے متعلقہ ان امور کا بیان مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے واضح ہے۔

۱) تلاوتِ قرآن

قرآن حکیم کی تلاوت مسلمہ اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر:۲۹)

''بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس تجارت کے فائدے کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی''۔

ہادیٔ برحق حضرت محمد ﷺ کی حدیث پاک میں تلاوتِ قرآن کی فضیلت یوں بیان کی گئی ہے:

وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِي الصُّفَّةِ فَقَالَ: ((اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنْ يَّغْدُ وَكُلَّ يَوْمٍ اِلٰى بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِيْقِ فَيَاْتِيَ بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ فِيْ غَيْرِ اِثْمٍ وَّلَا قَطْعِ رَحِمٍ)) فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِكَ۔ قَالَ :((اَفَلَا يَغْدُوْ اَحَدُكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَيَعْلَمُ اَوْ يَقْرَاُ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ نَّاقَتَيْنِ وَثَلَاثٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ ثَلَاثٍ وَّاَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ اَرْبَعٍ وَّمِنْ اَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْاِبِلِ)) (صحیح مسلم)

''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی اکرم ﷺ باہر تشریف لائے تو ہم مقام صفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے ہم سے فرمایا: ''تم میں سے کون یہ پسند کرتا ہے کہ وہ روزانہ بطحان (ایک وادی) یا عقیق (ایک جگہ کا نام جو مدینہ منورہ سے دو یا تین میل کے فاصلے پر تھی۔) کی طرف جائے اور وہاں سے دو اونٹنیاں بڑے کوہان والی بغیر کسی گناہ کے اور انقطاع صلہ رحمی کے لائے؟'' ہم نے کہا کہ یارسول اللہ! ہم سب پسند کرتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص مسجد جاتا ہے اور وہاں اللہ کی کتاب کی دو آیات کسی کو سکھاتا ہے یا خود پڑھتا ہے تو وہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتیں اس کے لئے تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں اس کے لئے چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ (حاصل یہ کہ) اونٹنیوں کی

تعداد آیات کی تعداد سے (ہر صورت میں) کم تر ہے''۔

اہل ایمان پر جب کتاب عزیز کی آیاتِ بینات تلاوت کی جاتی ہیں تو اس وقت ان کی قلبی کیفیت اور ایمانی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (الانفال:۲)

''اہل ایمان تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں''۔

اور فرمایا:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الزمر:۲۳)

''اللہ تعالیٰ نے نہایت اچھی کتاب نازل فرمائی ہے (جس کی آیات باہم) ملتی جلتی اور دہرائی جانے والی ہیں۔ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں (اس پاک کتاب کی آیات کی تلاوت سے) ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے' وہ اس سے جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور جسے وہی گمراہ کر دے اسے راہ دکھانے والا کوئی نہیں''۔

حسن بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے استفسار کیا کہ قراءتِ قرآن کے وقت صحابہ کرام ﷺ کی کیا حالت ہوتی تھی؟ آپؓ نے فرمایا: ''وہ ایسے تھے جیسے ان کی مدح اللہ تعالیٰ نے کی ہے' یعنی ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے اور ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا''۔ (تحفۃ الواعظین لابن الجوزی' ص۱۲۴' اردو)

قرآن پاک کے ادب کا تقاضا ہے کہ اس کی تلاوت کو روزمرہ کے معمولات میں شامل کیا جائے اور حتی الامکان اس سلسلے میں تساہل اور لاپرواہی برتنے سے اجتناب

کیا جائے۔ قرآن حکیم کی تلاوت پڑھنے والے کے دل میں عمل کا جذبہ پیدا کرتی اور نیکی کو مہمیز دیتی ہے۔ جو لوگ تلاوتِ قرآن کا استقلال و ثابت قدمی سے التزام و اہتمام کرتے ہیں وہ عملی اعتبار سے اگرچہ سست رو ہی کیوں نہ ہوں' پھر بھی اس شخص سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں جس نے کبھی قرآن حکیم کو کھولا بھی نہ ہو۔

ہر شخص روزمرہ تلاوتِ قرآن کا نصاب اپنی سہولت اور وقت کی کیفیت کو مدنظر رکھ کر ترتیب دے سکتا ہے' تاہم حفاظِ کرام کے لئے مناسب ہے کہ وہ روزانہ کم از کم دو پاروں کی دہرائی کا اہتمام کریں' تاکہ اللہ کی توفیق اور مہربانی سے نسیان کا امکان باقی نہ رہے۔ جیسا کہ علامہ وحید الزماں نے ''موطا امام مالکؒ'' کے ترجمہ (ص ۱۷۲) میں بیان کیا ہے۔

۲) فہمِ قرآن

قرآنِ حکیم جن و انس کے نام خالق کائنات کا لازوال پیغام ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں تمام شعبہ ہائے زیست کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ قرآنی احکام و تعلیمات کا اعجاز ہے کہ ان میں انفرادی اور اجتماعی امور و معاملات پر یکساں انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کسی بھی معاملے کو اپنی اصل کے اعتبار سے تشنۂ بحث اور نامکمل نہیں چھوڑا گیا۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں در آنے والی لاتعداد اخلاقی و شرعی برائیوں کا اصل سبب قرآن حکیم کی دعوت سے ناآشنائی اور اس کے فرامین سے بے خبری ہے۔ معاشرے کے اخلاقی مفاسد پر بحث کی جائے یا معیشت میں وارد شدہ برائیوں پر توجہ مرکوز کی جائے' عالم اسلام کی استبداد و استعمار کے سائے تلے پروان چڑھنے والی عمومی ذہنیت پر روشنی ڈالی جائے یا دین و سیاست کے مابین فرق روا رکھنے والے ''اربابِ عقل و خرد'' کے اندازِ فکر اور اسلوبِ تدبر کو پرکھا جائے' غرضیکہ جس جگہ بھی علمی و عملی لغزش کے آثار ملیں گے اسی جگہ ''فہم قرآن'' کی عدم موجودگی بھی دریافت ہوگی۔ خود قرآن نے بھی تطہیر باطن اور اصلاحِ ظاہر کے لئے تدبر قرآن ہی پر ان الفاظ میں زور دیا ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ٢٤)

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر قفل لگ رہے ہیں؟''

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ١٧)

''تحقیق ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے' پس کوئی ہے جو (اس میں) تدبر کرے؟''

الاخوان المسلمون کے ممتاز رہنما سید قطب شہیدؒ اپنی تصنیف ''معالم فی الطریق'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جب ہم ان مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اسلام کے چشمۂ صافی (قرآن حکیم) کی طرف رجوع کریں تو ''علم برائے عمل'' کے احساس و جذبہ کے ساتھ اسے پڑھیں نہ کہ لطف اندوزی' تسکین ذوق اور بحث و تحقیق کے شوق کی بنا پر۔ ہم یہ معلوم کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کریں کہ وہ ہم سے کیسا انسان بننے کا مطالبہ کرتا ہے' تاکہ ویسا انسان ہم بن کر دکھائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مقصد حقیقی کے حصول کے دوران ہم پر قرآن کا فنی کمال اور ادبی حسن بھی آشکارا ہو جائے گا' اس کے حیرت انگیز قصے بھی ہمارا دامن دل پکڑیں گے' مناظر قیامت بھی آنکھوں کے سامنے جھلکیں گے' اور اس کی وجدانی منطق بھی ہمیں حاصل ہو گی۔ الغرض وہ سب لذتیں ضمناً ہمیں حاصل ہوں گی جن کی تلاش جویانِ علم کو ہوتی ہے اور جن کی طلب میں اربابِ ذوق سرگرداں رہتے ہیں۔ بے شک ان سب فوائد و لذائذ سے ہم ہمکنار ہوں گے لیکن یہ چیزیں ہمارے مطالعہ کا اصل مقصد نہ ہوں گی۔ ہمارا اصل مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہو گا کہ قرآن ہم سے کس طرح کی عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟'' (اردو ترجمہ' جادہ و منزل' ص۹۲' ۹۳)

مناسب یہ ہے کہ ترجمہ و تفسیر کے ساتھ احادیث مبارکہ کی روشنی میں قرآن حکیم پڑھنے کا اہتمام کیا جائے اور اس کی آیات پر تفکر و تدبر کیا جائے۔ بعض اہل فکر و نظر کے نزدیک قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنا اس کی تلاوت سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے جسے امام مالکؒ نے بیان کیا ہے:

عَنْ مَالِکٍ اَنَّہٗ بَلَغَہٗ اَنَّ عَبْدَ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا مَکَثَ عَلٰی سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ ثَمَانِیَ سِنِیْنَ یَتَعَلَّمُھَا

''امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سورۃ البقرۃ (کے احکام وفضائل اور اوامر ونواہی) کو آٹھ سال تک سیکھتے رہے''۔ (موطا امام مالکؒ 'کتاب القرآن' باب ماجاء فی القرآن)

اس کے علاوہ خطیب بغدادیؒ کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بارہ سال تک سورۃ البقرۃ سیکھتے رہے اور انہوں نے جب اسے ختم کیا تو ایک اونٹ کی قربانی دی۔ (دیکھئے: اوجز المسالک الیٰ موطا مالک' جلد۴' ص ۱۳۶۔ اور الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ جلد۱' ص ۳۰)

۳) قرآن پر عمل

اسلام ایک عملی زندگی کا نام ہے جس کے احکام وقوانین کی بنیاد مضبوط اساسات پر قائم ہے۔ یہ کسی تصوراتی دنیا یا غیر حقیقی اسلوبِ حیات کا نام نہیں کہ جس میں دخول ہی فقط مقصود ہو اور پھر انسان ہر طرح کی اخلاقی وشرعی حدود وقیود سے بالکلیہ آزاد ہو جائے' بلکہ اسلامی شریعت میں اُخروی نجات ودرجات کے حصول کے لئے اوامر ونواہی کا بجا لانا بھی اسی طرح لازمی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسولِ اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مابین گہرے ربط کو انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُخروی فوز وفلاح کو ان دونوں ہی کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں جس مقام پر بھی اہل ایمان کے لئے انعام واکرام یا نجات ودرجات کا تذکرہ ہے تو اس کے ذیل میں تقریباً ہر جگہ پر ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت'' (یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے) بھی ''ایمان اور اعمالِ صالحہ'' کے متصل ذکر کے

ساتھ مندرج ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (البقرة:٢٥)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دیں کہ ان کے لئے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرة:٦٢)

''جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست ہیں (ان میں سے) جو بھی اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھے گا اور نیک اعمال کرے گا تو ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا صلہ اپنے پروردگار کے پاس ملے گا اور (قیامت کے دن) ان کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اور فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرة:٨٢)

''جو لوگ ایمان لائیں اور نیک اعمال سرانجام دیں وہ جنت کے مالک ہوں گے، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾ (یونس:٩)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ان کا ربّ ان کے اعمال کی بدولت (ایسے محلوں) کی راہ دکھائے گا جن کے نیچے نعمت کے باغات میں نہریں بہہ رہی ہوں گی''۔

اور فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۞ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۞ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۞﴾ (العصر)

''زمانے کی قسم! انسان خسارے میں ہے' مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے''۔

سطورِ بالا میں مندرج آیات ''ایمان اور اعمالِ صالحہ'' کے مابین باہمی ربط کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ قرآن حکیم میں اس مفہوم کی مؤید بے شمار آیات موجود ہیں جن کا مکمل احاطہ اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی کئی احادیث مبارکہ بھی شہادتین کے ساتھ اعمالِ صالحہ اور قرآن پاک پر عمل کرنے کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں:

عَنْ عُثْمَانَ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَاُبَی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یُقْرِئُهُمُ الْعَشْرَ فَلَایُجَاوِزُوْنَهَا اِلٰی عَشْرٍ اُخْرٰی حَتّٰی یَتَعَلَّمُوْا مَا فِیْهَا مِنَ الْعَمَلِ' فَیُعَلِّمُنَا الْقُرْآنَ وَالْعَمَلَ جَمِیْعًا۔

''حضرت عثمان بن عفان' عبد اللہ بن مسعود اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ انہیں دس (آیات) پڑھایا کرتے' اس کے بعد وہ اگلی دس (آیات) کی جانب اس وقت تک متوجہ نہیں ہوتے تھے جب تک وہ پڑھی گئی آیات (کے احکام و مسائل اور اوامر و نواہی) پر عمل کرنا سیکھ نہیں لیتے تھے' پس آپ ہمیں قرآن اور (اس پر) عمل دونوں اکٹھے سکھایا کرتے تھے''۔ (الجامع لاحکام القرآن' ج ۱' ص ۳۰)

کتب احادیث میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:

((مَنْ قَرَءَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِیْهِ اُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ' ضَوْءُهٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِی بُیُوْتِ الدُّنْیَا' لَوْ کَانَتْ فِیْکُمْ' فَمَا ظَنُّکُمْ بِالَّذِیْ عَمِلَ بِهٰذَا))

''جو شخص قرآن پڑھے اور (پھر) اس پر عمل کرے تو قیامت کے روز اُس کے والدین کو ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا کہ جس کی روشنی نورِ آفتاب سے بھی بڑھ کر ہوگی' اور اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں ہی میں اتر آئے' پس (جس عامل

قرآن کے والدین کا اس قدر اکرام ہوگا تو خود) اس کے مقام و مرتبہ کے متعلق تمہارا کیا اندازہ ہے؟'' (ابوداؤد' مسند احمد۔ اس حدیث کی اسناد میں ضعف ہے۔ دیکھئے: مرعاۃ المفاتیح' جلد ۷' ص ۲۱۶)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو شخص عمل اس لئے نہیں کرتا کہ علم ہی نہیں رکھتا اس کے لئے ایک ہلاکت ہے' لیکن جو علم رکھنے کے باوجود عمل نہیں کرتا اس کے لئے سات ہلاکتیں ہیں۔ (جامع بیان العلم وفضلہ' ص ۱۳۶)

سوال یہ ہے کہ کیا نیک اعمال ایمان کے وجود کے لئے ضروری ہیں یا یہ اس کی تکمیل کے لئے لازمی ہیں؟ اگر اعمالِ صالحہ ایمان کے وجود کے لئے لازمی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک اعمال نہیں کرتا وہ شہادتین کے اقرار کے باوجود مؤمن نہیں اور اگر اعمالِ صالحہ ایمان کے وجود کے لئے نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہوں تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص شہادتین کا اقرار تو کرے لیکن عبادات کی ادائیگی نہ کرے اس کا شمار تو اہل ایمان ہی میں ہوگا مگر اس کا ایمان ناقص اور نامکمل ہوگا۔ تاہم اس بارے میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ ایک کے نزدیک اعمالِ صالحہ ایمان کے وجود کے لئے لازمی ہیں جبکہ دوسرے کے نزدیک یہ ایمان کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: حقیقت ایمان' از ڈاکٹر اسرار احمد۔ نیز دیکھئے: فتاویٰ صراطِ مستقیم از مولانا محمود احمد میر پوری' ص ۴۱)

ہمارے نزدیک دوسرا قول ہی راجح ہے اور جس قدر ہم علم رکھتے ہیں اس کے مطابق جمہور علمائے اُمت کا بھی یہی موقف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ تاہم اس بحث سے عمل کی اہمیت و قدر میں (معاذ اللہ) کمی کرنا مقصود نہیں بلکہ اس حقیقت کا بیان کرنا مطلوب ہے کہ اسلام کی نظر میں اعمالِ صالحہ کوئی اضافی یا فاضل شے نہیں بلکہ لازمی امر ہیں' جن کا بقدرِ قدرت التزام ہر کلمہ گو کے لئے ضروری ہے۔ جو لوگ توحید و رسالت کی گواہی ہی کو باعث نجات اور اپنے اسلاف کے اعمال ہی کو ذریعۂ درجات تصور کرتے ہیں ان کے لئے اس فرمان میں سبق آموز عبرت پنہاں ہے جو نبی اکرم ﷺ نے اپنی

دخترِ عزیز حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

((یَافَاطِمَۃُ! اَنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ ' فَاِنِّیْ لَا اَمْلِکُ لَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا غَیْرَ اَنَّ لَکُمْ رَحِمًا سَاَبُلُّھَا بِبَلَالِھَا))

''اے فاطمہ! اپنی جان کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ' کیونکہ میں اللہ کے ہاں تمہارے لئے کچھ اختیار نہیں رکھتا' البتہ تم جو مجھ سے ناطہ رکھتے ہو اسے میں جوڑتا رہوں گا (یعنی دنیا میں تمہارے ساتھ حسن مروت اور احسان قرابت کے ساتھ پیش آتا رہوں گا)''۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی' جلد۲' ص۱۰۸۱)

اعمالِ صالحہ کے بارے میں بحیثیت مجموعی ہم سب کا طرزِ حیات اور اسلوبِ زیست انتہائی افسوس ناک اور غم انگیز ہے۔ آج اہل اسلام کی اکثریت کلمہ گو ہونے کے باوجود اسلامی احکام وتعلیمات سے بے پروا ہے۔ مسئلہ عمل کے فقدان کا ہے تو ضمیر کا بحران اس کی شدت میں مزید اضافے کا موجب بن جاتا ہے۔ ہماری مراد اس حقیقت سے ہے کہ ملت اسلامیہ کی اکثریت اس احساس ہی سے عاری اور اس فکر ہی سے ناآشنا ہے کہ قرآن پاک کا مقصد نزول اسے طاقوں کی زینت بنانا نہیں بلکہ اس کی تعلیمات کے سانچے میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ امور و معاملات کو ڈھالنا ہے۔ اگر قرآن حکیم کا ادب ہی مقصود ہے تو اس کے اظہار کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے حقوق کی بطریق احسن ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقدس کتاب کو بوسہ دے کر پیشانی سے لگانا' معطر جزدان میں لپیٹ کر الماری میں سجانا اور پھر روزمرہ کے جملہ امور میں اسی پاک کلام کے احکام کی نافرمانی کرنا اس کا ادب نہیں بلکہ بدترین (اللہ کی پناہ) تذلیل وتحقیر ہے۔ جس پاکیزہ کتاب اور مطہر صحیفے کو آنکھوں میں سمایا اور دل میں بسایا جائے' دعویٰ تو اس کی محبت کا کیا جائے جبکہ اطاعت وفرمانبرداری اللہ کے دشمن ابلیس لعین کی ہو' یہ کتاب عزیز کے ادب کا کون سا قرینہ ہے؟؟

اعمالِ صالحہ کے بیان میں اس حقیقت کی توضیح بھی ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کے احکام دو حصّوں میں منقسم ہیں:

۱) عبادات ۲) معاملات

عبادات میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ شامل ہیں، جبکہ معاملات کی قسم معاشرتی وتجارتی اور خانگی وسیاسی امور کی تعلیمات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کا فکری المیہ یہ ہے کہ اس میں رائج عمومی رجحان کے تحت صرف نماز، روزہ ہی کو مکمل دین تصور کیا جاتا ہے اور کامل مسلمان اسے ہی سمجھا جاتا ہے جو پانچ وقت کا نمازی ہو، اگرچہ اس کی تجارت سودی لین دین پر مبنی ہو، ہمسائے اس کی حرکات سے نالاں ہوں اور گناہ اس کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہوں۔

واضح ہو کہ جس دین اسلام کی نیّر وتاباں اور درخشاں وتابندہ تعلیمات کو سرور کائنات حضرت محمد ﷺ لے کر مبعوث ہوئے اس میں نماز اور روزہ وغیرہ کے احکام بھی ہیں اور تجارت ومعیشت کے ضوابط بھی، معاشرتی اچھائیوں مثلاً سچ بولنے، کسی کو دھوکا نہ دینے، ہمسائے کے ساتھ اچھا سلوک کرنے، والدین کے ساتھ بھلائی برتنے کے دروس بھی ہیں اور سیاست کے مسائل بھی۔ اسلام مجرد نماز پڑھنے کا نام ہے نہ روزہ رکھنے کا، یہ تو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جسے مکمل طور پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا استطاعت کے مطابق جس قدر بھی ممکن ہو، پورے اسلام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے''۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا (۲)

تحریر: حامد سجاد طاہر*

بیداریٔ یورپ

جہاں اور جس جگہ فلسفہ اور علومِ مادیہ مسلمانوں میں غروب ہوئے تھے وہیں سے وہ یورپ میں طلوع ہوئے۔ دوسری ہزاری کے آغاز میں اندلس کی یونیورسٹیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ یقیناً اس وقت عالم اسلام میں دیگر تعلیمی ادارے بھی موجود ہوں گے تاہم ایک تو مکانی اعتبار سے اندلس یورپی اقوام کے لئے قریب ترین تھا دوسرے وہاں پر پائی جانے والی آزاد خیالی بھی باقی خطوں کی نسبت زیادہ تھی جس کی وجہ ان کا علومِ عقلیہ میں سب سے آگے ہونا تھا۔ چنانچہ یورپ کے نوجوانوں نے وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ویسے ہی جانا شروع کر دیا جس طرح آج کل مسلم نوجوان مغرب کا قصد کرتے ہیں۔ تو جس طرح ہمارے نوجوان وہاں سے خیالات مستعار لے کر آتے ہیں بعینہٖ مغربی نوجوان بھی ان افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پھر مسلم سپین میں یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی ایک قابل ذکر تعداد یہودی تھی (جس طرح آج یورپ اور امریکہ میں ہے) لہٰذا انہوں نے آزاد خیالات کو ان کے ذہنوں میں انڈیلا۔ یورپ میں اُس وقت ویسے بھی عوام الناس کلیسا کی چارہ دستیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے لہٰذا ان میں آزادی کے ان تصورات کو بہت ہوا ملی اور پھر اندلس ہی کے ایک فلسفی ابن رشد کی تصانیف کا وہاں یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور انہیں مختلف یورپی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیا گیا اور یورپ از سرِ نو ارسطو اور اس کی منطق سے مستفید ہوا' بلکہ متعارف ہوا۔

ان تمام عوامل نے مل کر کام دکھایا اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں بیک

☆ متعلم قرآن کالج لاہور

وقت دو تحاریک نے جنم لیا جن کو ''تحریک احیاء العلوم'' (Renaissance) اور ''اصلاح کلیسا'' (Reformation) کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ (یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یورپ میں یہ انقلاب کوئی ایک دن یا چند سالوں میں برپا نہیں ہوا' بلکہ اس میں صدیاں لگی ہیں)۔ بہر حال لوتھر نے کئی ایسے پادریوں کے ساتھ مل کر جو خود بھی رومی کلیسا سے وابستہ تھے' رومن کیتھولک چرچ اور اس کے اختیارات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جس کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ مذہب وجود میں آیا جس کی بدولت سائنس اور فلسفے کے لئے راہ مزید ہموار ہوئی اور سترھویں صدی عیسوی میں سائنس کا دَور شروع ہوا۔

اس موقع پر رومی کلیسا سے ایک اور غلطی یہ صادر ہوئی کہ اس نے فلسفیانہ افکار کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا جس سے سائنس اور مذہب کے مابین بھی ایک جنگ شروع ہوگئی۔ تاہم اس کے باوجود ابتدائی سائنس دان مثلاً ڈیکارٹ' باؤلے اور نیوٹن وغیرہ مذہب کے مخالف یا کم از کم منکر خدا ہرگز ہرگز نہ تھے' بلکہ باؤلے کے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ وہ تمام اہم تجربے اتوار کو ہی کیا کرتا تھا۔ نیوٹن تو انتہائی درجے کا مذہبی آدمی تھا۔ وہ بائبل کا بھی گہرا مطالعہ رکھتا تھا اور اس کی مذہبی تحاریر کی تعداد سائنسی تحاریر سے زیادہ ہی ہے۔ تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مذہب کو جو دھچکے ان سائنس دانوں کی کاوشوں سے لگے دراصل انہوں نے ہی موجودہ مغربی فکر کی بنیاد رکھی۔

اور پھر فلسفہ بھی جس کا کام قرونِ وسطیٰ میں بڑی حد تک مذہب کی چاکری کرنا رہ گیا تھا' اس کے اثرات سے آزاد ہوا اور اپنے فطری حلیف سائنس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا (اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تقریباً تمام ابتدائی اہم فلاسفہ سائنس دان بھی تھے یا اس سے اچھی طرح آگاہ تھے) اور اس کی تشریح و توضیح کا کام سرانجام دینے لگا۔ فکری سطح پر تو انہوں نے کوئی خاص نیا نظریہ پیش نہیں کیا۔ بالفاظِ دیگر فلسفے کی اس پرانی شراب کو سائنس کے نئے جام میں پیش کیا۔ مزید

برآں انہوں نے مذہب کا ہی نہیں تقریباً ہر اُس فلسفے کا بھی ابطال کیا جو کسی بھی شکل میں مذہب کا مدد و معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں ہیوم نے لاادریت کا پرچار کیا اور عقلی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ عقلِ انسانی خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ اسی بات کو کانٹ نے اپنی مشہورِ عالم کتاب ''تنقیدِ عقلِ خالص'' میں انتہا تک پہنچا دیا۔ ڈارون نے نظریہ ارتقاء پیش کر کے گویا مذہب کے آخری قلعہ کو بھی مسمار کر ڈالا جس کا نتیجہ کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت اور فلسفۂ اشتراکیت کی صورت میں نکلا۔ فرائڈ نے تمام مذہبوں کو انسانی خوف کا مظہر قرار دیا۔ منطقی اثباتیت نے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو لغو اور مہمل قرار دے کر انہیں اپنی بحثوں سے باہر نکال دیا اور بالآخر نطشے نے ببانگ دہل اعلان کیا ''خدا مر چکا ہے' اب ہر کوئی اپنے عمل میں آزاد ہے''۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

المختصر یہ کہ یورپ میں اڑھائی تین سو برس قبل جو خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے تھے اور جو بھی مکاتب فکر وجود میں آئے تھے ان سب میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ ماورائی یا خیالاتی تصورات کی جگہ مادّی حقائق کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لہٰذا خالص علمی سطح پر تو سائنس نے بھی اور منطقی اثباتیوں نے بھی کھلے عام خدا کا انکار نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ ''اگر کوئی شے واقعتاً ہمارے حواس کے دائرے کے باہر موجود ہے تو ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض کر بھی لیں تو اسے دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے' اس لئے ایسی کسی بھی شے کا علم حاصل کرنے کی ہر کوشش سعی لا حاصل ہے''۔ لہٰذا انہوں نے اسے اپنے دائرۂ کار سے نکال دیا اور توجہات دوسری جانب مرتکز کر لیں۔ اس ردِّ عمل کی بنا پر یہ خیالات دماغوں سے نکلتے چلے گئے یا کم از کم غور و فکر کا مرکز نہ رہے جس سے تمام توجہات خدا سے ہٹ کر کائنات' روح سے ہٹ کر جسم اور حیاتِ اُخروی سے ہٹ کر حیاتِ دُنیوی پر مبذول ہو گئیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم ڈیکارٹ کی درج ذیل مثال کا سہارا لیتے ہیں:

''تمام فلسفے کی مثال ایک درخت کی سی ہے جس کی جڑیں مابعد الطبیعیات

تصورات ہیں' تا طبیعیات ہے اور تنے سے نکلنے والی تمام شاخیں تمام دیگر مادی علوم ہیں جن کو تین بنیادی علوم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی طب (Medicine)' میکینکس (Mechanics) اور اخلاقیات (Morals)۔ اخلاقیات سے میری (یعنی ڈیکارٹ کی) مراد وہ اعلیٰ ترین اور اکمل ترین اخلاقی نظام ہے جو کہ تمام دیگر سائنسی علوم کی بنیادوں پر کھڑا ہوا اور یہ حکمت کا بلند ترین درجہ ہے۔ اب یہ درخت کی جڑیں یا تنا نہیں ہے جہاں سے کوئی پھل پائے گا' بلکہ یہ تو شاخوں کے سرے ہیں (جہاں سے پھلوں کا حصول ممکن ہے) چنانچہ فلسفے کا اصولی فائدہ ان حصوں سے حاصل ہوتا ہے جنہیں سب سے آخر میں سیکھا جاتا ہے''۔

اب ہم اس اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مابعد الطبیعی تصورات کا انکار اس نے بھی نہیں کیا' تاہم اس نے ان خطوط کی طرف نشاندہی کی ہے جن سے توجہ کا اصل مرکز تین دیگر علوم بن جاتے ہیں' یعنی:

۱) میکینکس' جس کا تعلق کائنات کے ساتھ ہے۔

۲) طب' جس کا تعلق انسانی جسم کے ساتھ ہے' اور

۳) اخلاقیات کا صرف وہ حصہ جس کا تعلق حیاتِ دُنیوی کے ساتھ ہے۔

اور دراصل یہی وہ تین بنیادی نکات ہیں جن پر جدید مغربی فکر کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اب اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ خدا ہی اصل حقیقت ہے اور کائنات کی حقیقت اس کے سامنے ایک ادنیٰ مخلوق سے زائد نہیں ہے اور پھر روح ہی حیاتِ انسانی کی اصل حقیقت ہے اور انسان کی عظمت اور مسجودِ ملائک ہونے کی اصل بنیاد ہے' ورنہ بدن کے لحاظ سے تو انسان بس ایک نسبتاً بہتر حیوان سے زائد نہیں ہے اور پھر حیاتِ اُخروی ہی اصل اور باقی رہنے والی زندگی ہے اور اس کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی کی حیثیت محض ایک کمرۂ امتحان سے زائد نہیں ہے' جس کے تمام مال و متاع کی وقعت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک پرکاہ سے زائد تو کیا اتنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ﴿اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی﴾ کے مصداق انسان اپنی صلاحیت کار کو جس کام میں بھی استعمال کرے گا اپنے نصیب

کے مطابق پھل پائے گا۔ وہ گمراہی کے لئے کوشش کرے گا تو اللہ اس کے لئے گمراہی کی راہ کو آسان کر دے گا' وہ ہدایت کے لئے کوشاں رہے گا تو اللہ اس کے لئے ہدایت کی راہ کھول دے گا۔ ان شاء اللہ' یعنی اگر اس نے چاہا۔ اسی لئے اگرچہ خدا کے مقابلے میں کائنات' آخرت کے مقابلے میں دنیا اور من کے مقابلے میں تن کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے' لیکن جس طرح ایک ذرّے کی حیثیت یوں تو سورج کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن جب اس ذرّے کو پھاڑا گیا تو اس میں سے ایک اور سورج برآمد ہو گیا ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!

بعینہٖ اسی طرح جب تمام توجہات کا مرکز یہی تین چیزیں بن کر رہ گئیں تو ایسے ایسے انکشافات سامنے آئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں اور اس سب کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ان مسلسل ہونے والی ایجادات اور دریافت کی قوت سے لیس ہو کر یورپ باقی دنیا کے لئے ناقابل تسخیر بنتا چلا گیا تو دوسری طرف سائنسی میدانوں میں ہونے والی یہ ترقی بذاتِ خود اس بات کی دلیل بنتی چلی گئی کہ اصل قابل توجہ شے دراصل مادّہ اور اس کے قوانین ہیں نہ کہ خدا' اور جسم اور اس کی حقیقت ہے نہ کہ روح اور اس کی غذا' اور دنیا اور اس کی آسائشیں ہیں نہ کہ آخرت۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر کسی حلقے سے ان تین چیزوں کی جانب توجہ دلانے کی صدا بلند ہوتی ہے تو اس کا مسکت جواب یہی دیا جاتا ہے کہ اس طرح تو ہم دنیا میں پیچھے رہ جائیں گے یا سائنس کے میدان میں دنیا کا مقابلہ نہ کر سکیں گے ع

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی!

یورپ کا عالم اسلام پر دھاوا اور اس کا ردّعمل

اب انہی مادی قوتوں اور طاقتوں سے لیس ہو کر جب یورپ نے مشرق کا رُخ کیا تو کوئی دیوار اس کی راہ میں سدّ سکندری ثابت نہ ہو سکی۔ صرف سلطنت عثمانیہ ان کی راہ میں ایک رکاوٹ تھی مگر اس کا حل واسکوڈے گاما نے ایک متبادل راستہ تلاش کر کے

نکال لیا اور یورپی ممالک نے تقریباً بقیہ تمام عالم اسلام پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد انہی میں سے کرائے کی فوجوں کے ذریعے آخر میں خلافت عثمانیہ کا کانٹا بھی نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔

یورپی اقوام کا یہ غلبہ اولاً تو عسکری ہی تھا لہٰذا اس کا اوّلین ردّعمل بھی عسکری ہی نکلا اور مختلف جگہوں پر آزادی کی جنگیں لڑی گئیں۔ مثال کے طور پر برعظیم کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی۔ اسی طرح مختلف قائدین نے جنم لیا جن کے پیش نظر اوّلین مقصد آزادی ہی تھا۔ چنانچہ مہدی سوڈانی ہو یا کوئی اور، سب کا اصل مقصد تو یہی تھا، ہاں ساتھ ہی عوام کے جوش و جذبے کو ابھارنے کے لئے کچھ ذیلی اور ضمنی قسم کے نعرے بھی لگوائے گئے۔ شاعر ہو یا خطیب سب نے ہی مسلمانوں کو وہی پرانا عسکری غلبہ یاد دلایا اور انہیں اس کے لئے ابھارنے کی کوشش کی، چنانچہ کہیں مسدّس پڑھی گئی تو کہیں شاہنامے کو سنا گیا۔

سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ یورپی اقوام نے عالم اسلام میں اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ بھی شروع کی۔ اکثریت تو پہلے ہی یورپ کی مادی ترقی سے متاثر تھی اور اسے انگریز کی ہر ادا میں حسن نظر آ رہا تھا۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زندہ قوم کم از کم بنیادی انسانی اوصاف سے مزیّن ہوتی ہے۔ جیسے نظم و ضبط، وقت کی پابندی اور صفائی وغیرہ۔ لہٰذا محکوم قوم اس سے بھی مرعوب ہوئی اور اس کے ہر اُس طبقے نے جو اِس بات کی ہمت و صلاحیت رکھتا تھا، یورپ کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ خالص فلسفے اور عمرانیات کے معاملے میں چونکہ یورپ میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا تھا چنانچہ یہاں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ ترجیح و انتخاب کا معاملہ ہو گیا اور یار لوگوں نے بزعم خود اسلام سے قریب ترین چیزیں چننے کا کام کیا، لیکن سائنس اور اس کے اکتشافات چونکہ حتمی اور قطعی تھے لہٰذا اسے وحی کی طرح من و عن قبول کر لیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ وہی ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر تمام عالم اسلام کے کچھ نہ کچھ سوچنے والے عناصر کے اندر حلول کر گیا اور یورپ کی طرح یہاں بھی ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالحواس رائج ہو گیا اور

ہر مکتبِ فکر میں خدا کی جگہ کائنات' رُوح کی جگہ مادّہ اور حیاتِ اُخروی کی جگہ حیاتِ دُنیوی کی اہمیت مسلم ہوتی چلی گئی' یہاں تک کہ اس طوفانِ الحاد سے دینی و مذہبی ذہن رکھنے والے افراد بھی بچ نہ سکے۔

تھا جو ناخوب' بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

———☆———

اب ہم اپنی توجہات کا مرکز برصغیر یا جنوبی ایشیا کو ٹھہراتے ہیں اور ان کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جو اِس یورپی فکر کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے سلسلے میں کی گئیں۔ ۱۸۵۷ء تک کی تقریباً تمام تحریکوں کے پیشِ نظر تو انگریزوں کو ہند سے نکال باہر پھینکنا اور پھر سے مسلم حکومت کا قیام تھا' لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کے قائدین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب انگریزوں کو عسکری قوت کے بل بوتے پر یہاں سے نکالنا ممکن نہیں رہا' اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس کے بل بوتے پر وہ ہند میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں اور تلوار کی جگہ قلم کی طاقت کو استعمال میں لایا جائے۔ تاریخ مسلمانانِ ہند کے اس نازک موڑ پر دو شخصیات اٹھ کھڑی ہوئیں' یہ دونوں شخصیات ایک ہی استاد کی شاگرد تھیں' تاہم اس انتہائی اہم مرحلے پر دونوں نے اس امر پر تو اتفاق کیا کہ مسلمانوں کو ایک علاج کی ضرورت ہے' تاہم وہ علاج کیا ہو' اس ضمن میں اختلافات نے دونوں شخصیات کو الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کرنے پر مجبور کیا جنہوں نے دو متضاد تحاریک کی شکل اختیار کر ڈالی اور تاریخ ہند پر گہرے اثرات چھوڑے۔

(۱) علی گڑھ:

۱۸۷۷ء میں (یہاں یہ بات واضح رہے کہ علی گڑھ سکول ۱۸۷۵ء میں بن چکا تھا تاہم کالج ۱۸۷۷ء میں بنا) علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اُس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن نے اسے مسلم ہندوستان میں معاشرتی تغیر کا آغاز قرار دیا تھا اور یہ

پیشین گوئی مستقبل میں حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ سرسید نے جب اس کالج کا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کیا تو ان کے پیش نظر تین اہم مقاصد تھے:

۱) زمانے کا ساتھ دیا جائے۔

۲) اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

۳) ہم بھی یورپ کی طرح راہِ ترقی پر گامزن ہوں۔

لہٰذا انہوں نے جو تصور اس ادارے کا بنایا اس کے مطابق اس میں ایک انگلش کالج، ایک عربیک کالج اور ایک اردو کالج ہونے تھے۔ تاہم چونکہ ادارے کا انحصار بڑی حد تک سرکاری گرانٹ پر تھا لہٰذا باقی دو کالجز کی بساط لپیٹ کر صرف انگلش کالج کا قیام عمل میں لایا گیا اور تالیف قلب کے واسطے سو نمبر کی اسلامیات کو شامل نصاب کیا گیا جس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی اور نتیجتاً علی گڑھ اس کہاوت کا کہ ''حاکم قوم کی تہذیب ہی محکوم قوم کا مذہب ہوتی ہے'' عملی نمونہ بن کر رہ گیا اور مذہب کے ایک لادینی ایڈیشن کو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں پیش کر دیا گیا جس سے دین و مذہب کی تو جان نکل گئی تاہم اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت درپیش نہ ہوئی۔

سرسید اور ان کے شاگردوں نے علی گڑھ کے ذریعے جس مکتب فکر کی بنیاد رکھی اس کا اصل الاصول عقل کی نقل پر حکمرانی تھی۔ انہوں نے نقل کے معاملے میں ہر اُس میدان سے پسپائی اختیار کی جہاں نقل کو عقل پر نبرد آزما پایا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سرسید آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے آیاتِ آفاقیہ کا مطالعہ کرتے، مگر انہوں نے سائنس کی روشنی میں قرآن اور اسلام کا مطالعہ بلکہ کانٹ چھانٹ شروع کر دی اور کھلی گمراہی کا شکار ہو گئے۔ اس مکتب فکر کے نمائندوں میں سرسید احمد خان، پروفیسر فضل الرحمٰن، غلام احمد پرویز اور جسٹس امیر علی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں اس تحریک کے دس اہم نظریات بیان کئے جا رہے ہیں:

۱) دُنیوی یا مادی کامیابی ہی نظریات و افکار کی صحت کا اصل معیار ہے۔

۲) ہمارا علاج صرف اور صرف یورپ ہی کی طرح سائنسی ترقی کرنے میں ہے۔

۳) یہ دنیا خدا کی محتاج نہیں (معاذ اللہ)
۴) فرشتوں سے قرآن کی مراد قوانین فطرت ہیں۔
۵) لہٰذا حضرت جبرئیلؑ کوئی شخص یا ہستی نہیں ہیں اور قرآن حضور اکرم ﷺ کے دل پر نازل کیا گیا جسے بعد میں آپ نے الفاظ کا پیرایہ پہنایا۔
۶) مشتعل مزاج اور اجڈ افراد کو قرآن نے جنات سے تعبیر کیا ہے۔
۷) جنت و دوزخ حقیقی جگہیں نہیں' بلکہ صرف ذہنی کیفیات کا نام ہے۔
۸) جہاد کا اصل اور واحد مقصد دفاع ہے۔
۹) تمام معجزات دراصل سائنسی اتفاقات تھے۔
۱۰) اسلام میں رواداری کا غلط تصور پیش کیا گیا۔

۲) دیوبند

دیوبند دراصل مصالحت کی جگہ مدافعت کا نام تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں یہ گویا سنتِ اصحابِ کہف کا اتباع تھا' یعنی جس طرح اصحابِ کہف نے مقابلے کی سکت نہ رکھ سکنے کے باعث ایک غار میں پناہ لے لی تھی' یہ بھی اپنے مکتبوں' مدرسوں اور مسجدوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہر طعنے کو سہا مگر اپنی روش نہ چھوڑی۔ انتہائی مسدود حالات میں بھی اپنی انا کو طاق میں رکھ کر مسلمانوں سے ہی مدد چاہی مگر سرکاری مدد کی طلب نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادارہ مغربی استعمار اور فکر کے خلاف ایک بغاوت کی علامت بن کر رہ گیا اور مؤمن کے توکل علی اللہ کے جذبے کی عملی شکل بن گیا۔

اس دار العلوم کا آغاز ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی قیادت میں سہارن پور (یو۔پی' بھارت) کے ایک قصبے دیوبند کی مسجد چھتہ میں ہوا۔ اس کے اوّلین شاگرد مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے جو بعد میں شیخ الہندؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس تحریک کو پانچ نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:
۱) افکار و نظریات کی صحت کا اصل معیار قرآن اور اقوالِ شارحِ قرآن ہیں۔

۲) عقل کا استعمال صرف قرآن وحدیث کے معروضی مطالعے کے لئے کیا جائے۔
۳) عقائد اور فقہ حنفی کو بلا چون وچرا مانا جائے۔
۴) آٹھ سو سال پرانے فلسفے اور منطق کو تو نصاب میں جگہ دی گئی مگر جدید رجحانات کی جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔
۶) اور عملاً جدید علوم مثلاً سائنس اور فلسفۂ جدید سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

چنانچہ یہ تحریک مغربی سیلاب کے سامنے بند تو نہ باندھ سکی البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کی بدولت ایک طبقے کی ایمان کی دولت محفوظ رہ گئی' مادہ پرستی کے اس دورِ ظلمت میں کہیں کہیں روحانیت کی شمعیں بھی جلی رہ گئیں اور قرآن وحدیث کے علوم کے تحفظ کی بنا پر دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا۔ تاہم اسلام وایمان کے تحفظ کے باوجود عقل کو سرے سے ہی قابل اعتناء نہ جاننے کے باعث یہ ادارہ جمود کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ تقلید یورپ کا داعی تھا تو یہ تقلیدِ اسلاف کی مثال بن کر رہ گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود دیوبند لاکھ کم نظر سہی مگر اسلام کا قلعہ بننا اسی کی قسمت میں لکھا تھا۔

ان دو متضاد اداروں نے دو متضاد تحاریک کو جنم دیا۔ علی گڑھ کی مثال پر لاتعداد سکول اور کالج ہندوستان کے طول وعرض میں قائم ہوئے تو دیوبند کو نمونہ بنا کر بے شمار مدارس بھی خیبر سے ڈھاکہ تک وجود میں آئے' جنہوں نے قوم کو دو متضاد طبقوں میں تقسیم کر دیا اور مسٹر اور ملاّ کی باہم کشاکش جاری ہو گئی۔ (جاری ہے)

ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' لاہور کا

عراق نمبر

شائع ہو گیا ہے' جس میں اسلام سے قبل عراق کی پانچ ہزار سالہ تاریخ' خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ میں عراق کا عروج' مغربی استعمار اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خوبصورت سرورق اور مستند ومعتبر اعداد وشمار ''عراق نمبر'' کو ایک مستقل حوالہ جاتی کتاب بناتے ہیں۔ قیمت: 20 روپے

فکرِ اسلامی کا عظیم سرمایہ (۴)

ایک مطالعاتی جائزہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

ایک نظریاتی جماعت کا دوسری نظریاتی جماعت کو نظامِ تعلیم کے ذریعہ ناکارہ بنانا

عضوی جسم کی زندگی پر ایک تقاضا مسلط رہتا ہے، وہ یہ کہ اس کی عضوی زندگی کو بقاء نصیب ہو۔ نظریاتی جماعت کی زندگی پر جس تقاضے کا تسلط رہتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مسلک کی محبت قائم رہے۔ جسم کے اندر ایک عضو ہوتا ہے، جس کو دل کہتے ہیں، زندگی کا مرکز یہی ہے، یہیں سے دوسرے اعضاء کو سیالِ حیات تقسیم ہوتا ہے، جس سے ان کی پرورش ہوتی ہے۔ اسی طرح نظریاتی جماعت میں ایک نظام ہوتا ہے، یعنی جماعت کا نظامِ تعلیم، یہی محبت کا مرکز ہے، یہیں سے تصورات تقسیم ہوتے ہیں جو افراد کے دلوں میں نظریہ کی محبت کو غذا پہنچاتے ہیں۔ جس طرح کوئی جانور دوسرے ذی حیات کا مرکزِ حیات ناکارہ کر دے تو اس کو ہلاک کر سکتا ہے اسی طرح سے ایک نظریاتی جماعت دوسری جماعت کو اس کا نظامِ تعلیم ناکارہ بنا کر صفحۂ ہستی سے مٹا سکتی ہے۔ مثال یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جب جاپان، جرمنی اور اطالیہ پر فاتح فریق کا قبضہ ہو گیا تو نازی، میکاڈوی اور فسطائی نظریات کو موت کی نیند سلا دینے کے بعد ان ممالک کے تعلیمی نظام بلا توقف برباد کر دیئے گئے۔ (تعلیم کے ابتدائی اصول، حصہ دوم، صفحہ ۳۶۔ تصنیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

تعلیم بجز انتقالِ محبت کے اور کچھ نہیں

تعلیم بجز اِس کے کچھ نہیں کہ نصب العین سے ہم آہنگ جو تصورات' جو حقائق' جو عادات' رویئے' خیالات' رجحانات' اغراض اور صناعیاں عزیز ہو گئی ہیں' جو رغبتیں اور نفرتیں دل میں بس گئی ہیں' جن اُمیدوں اور عزائم سے پیار ہے' مختصر یہ کہ نصب العین اور اس کے تقاضوں سے جو اُلفت ہے وہ ایک قلب سے دوسرے قلب میں منتقل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دو دل باہم محبت نہ کریں' ایک دوسرے کے محب و محبوب نہ بنیں' اس وقت تک انتقالِ محبت کا عمل ظہور میں نہیں آ سکتا۔ (ایضاً صفحہ ۴۶)

دنیا میں عقیدۂ توحید کے پھیلاؤ کے لئے بہتر صورت

مسلمان قوم تاریخ عالم میں اپنا رول جو اِس کے لئے مقرر ہو چکا ہے' اس طرح سے سَر کر سکتی ہے کہ عقیدۂ توحید کو پھر سے مظاہر قدرت کے علم کے ساتھ جوڑ کر ایک مؤثر آلۂ تسخیرِ قلوب بنائے۔ اس غرض کے لئے اسے کسی ایک اسلامی ملک میں جہاں حالات سازگار ہوں' سب سے پہلے ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے' جس کی نصابی کتابیں عقیدۂ توحید پر مبنی ہوں۔ پھر یہ یونیورسٹی ہر سال صحیح اور سچے مسلمانوں کی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک تعداد پیدا کرے گی۔ اس سے عقیدۂ توحید دنیا میں پھیلے گا۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں علوم کو مسلمان کرنے کا مقصد اس یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے بعد خود بخود حاصل ہو جائے گا' کیونکہ اس یونیورسٹی کے علوم کی برجستگی اور معقولیت خود بخود لوگوں کو اِن کی طرف مائل کرے گی۔ باطل خس و خاشاک کی طرح ہے' خواہ اس کے لاکھوں ابناء ہوں' حق کی ایک چنگاری اسے شعلہ بنا کر اڑا دینے کے لئے کافی ہے۔ (مضمون ڈاکٹر محمد رفیع الدین' ماہنامہ اسلامی تعلیم لاہور' نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء)

انسان کی جبلت کو چلانے والی پُر اِسرار قوت

انسان کی شخصیت ایسی بگھی کی مانند ہے جسے کوئی کوچوان چلا رہا ہو۔ انسان میں اعلیٰ درجہ کے حیوان کی جملہ خصوصیات مثلاً بچوں کی پرورش' جنسی خواہش' فرار'

جھگڑالو پن' خودنمائی اور خود پسندی وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ تاہم حیوان کے برعکس وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنی کسی جبلت کی تسکین کو اپنی مرضی کے مطابق محدود کر سکے' تاکہ تمام جبلتوں کی ایک منتخب سمت میں منظم اور متحد طریق سے رہنمائی کر سکے۔ حیوان کی طرح جبلتوں کی یہ روک تھام خود بخود اور غیر رضا کارانہ نہیں ہوتی' بلکہ رضا کارانہ انتخاب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان اپنی خواہشات کی ایسے انداز میں روک تھام کرتا ہے کہ کسی خاص جبلت کی خواہش اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ چنانچہ اکثر اوقات وہ اپنی جبلتوں سے فاقہ کشی کراتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی زندگی بھی جبلتوں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے' جس کے لئے یہ تمام جبلتیں سرگرم عمل ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے عمل کے لئے منتخب راستہ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ حیوان کی زندگی جداگانہ سرگرمیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ ہر سرگرمی کسی نہ کسی خواہش کی مغلوب ہوتی ہے اور اس کے مختلف مرحلوں میں کوئی رابطہ نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف انسان کی تمام سرگرمیاں اکائی کی صورت میں منظم ہوتی ہیں۔ ہر سرگرمی کی' خواہ وہ کسی حد تک بڑھنے کی مجاز ہو' ایک خاص انداز میں رہنمائی کی جاتی ہے اور اسے قابو میں رکھا جاتا ہے' تاکہ وہ نامیاتی طور پر کُل کا حصہ بن جائے۔ انسان میں پایا جانے والا جبلتوں کا یہ نظم وضبط' اتحاد' تسلط اور رہنمائی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس میں ایسی زبردست خواہش موجود نہ ہو جو دوسری تمام خواہشوں پر غلبہ پا سکے اور ان پر حکم چلا سکے۔ یہی خواہش یا جبلت وہ پُراسرار قوت ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی بنگھی کو چلاتی ہے۔ اس جبلت کو سمجھنا انسان کی حقیقت سے باخبر ہونے کے مترادف ہے' کیونکہ یہی خواہش انسان کی جملہ سرگرمیوں خواہ وہ سیاسی' قانونی' عسکری' معاشی' اخلاقی' تعلیمی' فکری اور مذہبی ہوں یا فنکارانہ' کا سبب ہوتی ہے۔ اسی جبلت نے تاریخ کو موجودہ شکل بخشی۔ کیونکہ تاریخ انسانی شخصیت کی بنگھی کے کوچوان کی اس طویل کوشش کے سوا کچھ نہیں' جس کا مقصد انسان اور معاشرہ کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔ (ایضاً)

ہمارے نظامِ تعلیم کی کمزوریاں اور ان کی اصلاح کا طریقِ کار

(۱) اسلامی تعلیم کے معنی یہ نہیں کہ ہم اسلامیات کے ایک مضمون کو آٹھویں جماعت تک نصابِ تعلیم میں شامل کر دیں۔ اگر ہم اسلامیات کے علیحدہ مضمون کو ایم اے اور ایم ایس سی کی آخری جماعت تک بھی شامل کر دیں تو اس سے ہمارا نظامِ تعلیم اسلامی نہیں بن سکتا۔ اسلامی نظامِ تعلیم وہی ہو سکتا ہے جس میں تمام علوم کی نصابی کتابیں اسلام کے نظریۂ انسان و کائنات کے مطابق ہوں۔ چونکہ اسلام کے نظریۂ انسان و کائنات کی روح خدا کا تصور ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نظامِ تعلیم اسلامی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابیں اس طرح نہ لکھی گئی ہوں کہ خدا کا تصور ان کے مواد کو منظم کرنے والا مرکزی اور محوری تصور ہو۔

مغرب میں جو مختلف علوم کی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اسلامی نظریۂ کائنات کے مطابق نہیں' کیونکہ ان کتابوں کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ صداقت وہی ہے جسے ہم حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ اعتقاد درست نہیں' اس لئے جو علوم اس اعتقاد کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے ناتمام اور ناقص رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نظریۂ کائنات کے مطابق سب سے بڑی صداقت جو تمام صداقتوں کی ابتدا اور انتہا ہے' خدا ہے۔ اگرچہ ہم خدا کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتے' تاہم مظاہرِ قدرت کے اندر جو نظم اور مقصد کے اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم خدا کے تصور کو ایک ایسے معقول علمی تصور کے طور پر قبول کریں جو تمام علوم کی جان ہو۔ علوم کے متعلق مغربی تہذیب اور اسلام کے نقطۂ نظر کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسلام مغرب کے ہر علمی موقف کو مِن وعَن تسلیم نہیں کرتا' بلکہ ہر علمی مسئلہ کے متعلق اپنے بنیادی تصورات کی روشنی میں اپنی جداگانہ رائے قائم کرتا ہے اور اپنا الگ فیصلہ صادر کرتا ہے' جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے نزدیک حق کیا ہے اور باطل کیا ہے' درست کیا ہے اور غلط کیا ہے' معقول کیا ہے اور نامعقول کیا ہے؟ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ حکمت کی کتاب ہے اور اُس ذاتِ پاک

نے نازل کی ہے جو آسمان اور زمین کے اَسرار و رموز کو جانتا ہے:

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (الفرقان:٦)

''(اے پیغمبر!) کہئے کہ اسے اُس ذاتِ پاک نے نازل کیا ہے جو کائنات کے اسرار و رموز جانتا ہے۔''

پھر قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دے:

﴿لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ﴾ (الانفال:٨)

''تاکہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے دے۔''

اور وہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ علمی مسائل سمیت ان تمام مسائل کے بارہ میں اپنے فیصلے صادر کرے جن میں لوگ اختلاف رکھتے ہیں:

﴿لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ﴾ (البقرة:٢١٣)

''تاکہ ان مسائل میں لوگوں کے درمیان فیصلے صادر کرے جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔''

چنانچہ قرآن حکیم انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ہمیں ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن کی روشنی میں ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن حکیم کے نزدیک علم، عقل، حکمت، سائنس، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات، سیاست، فن، اخلاق، تعلیم، اقتصاد، قانون، تاریخ، ارتقاء، نبوت، انسان، جبلت، نصب العین ایسے موضوعات کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سب موضوعات کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ تعلیم میں خدا کا تصور تمام علوم کا محوری تصور ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں بے خدا طبیعیات، بے خدا حیاتیات، بے خدا نفسیات، بے خدا سیاست، بے خدا قانون، بے خدا اقتصادیات، بے خدا تاریخ، بے خدا تعلیم اور ایسے اور بے خدا علوم اور منطقی اثباتیت (لاجیکل پازیٹوزم)، بی ہیویئرزم (نظریۂ کردار)، ماکسزم، فرائیڈزم، ایڈلرزم، میکڈوگلزم ایسے بے خدا فلسفے علمی نظریات کی حیثیت سے پڑھائے نہیں جا سکتے، بلکہ صرف ان کی منطقی اور عقلی غلطیوں کو سمجھانے کے لئے پڑھائے جا سکتے ہیں، کیونکہ

ان علوم اور نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح سے جب کوئی علم نظریۂ خدا کے تصور سے الگ ہو کر وجود میں آئے تو اس میں عقلی اور منطقی خامیاں اور ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم ایسے نظریات کی خامیوں اور ناکامیوں کو دریافت کر کے آشکار کرتا ہے۔ (اسلامی تعلیم، مئی، جون ۱۹۷۲ء)

تہذیبِ مغرب کے اس بنیادی عقیدہ نے کہ صداقت وہی ہے جسے ہم حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکیں اور خدا ایک ایسی صداقت نہیں، جتنا برا اثر انسانی اور سماجی علوم مثلاً فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ اقتصاد، فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ نفسیاتِ فرد اور فلسفۂ نفسیاتِ جماعت، فلسفۂ علم اور فلسفۂ فن وغیرہ پر ڈالا ہے اتنا طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم پر نہیں ڈالا۔ طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم میں تو پھر بھی مغرب کے سائنس دان بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کے مدعی ہیں (اگرچہ وہ کامیابیاں ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں جو اِن علوم میں خدا کے تصور کو داخل کرنے سے انہیں حاصل ہو سکتی ہیں) لیکن انسانی علوم میں وہ اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اعتراف رو رو کر کرتے ہیں۔ ان علوم میں ان کی بے مائیگی کا سبب یہ ہے کہ خدا کے اسلامی تصور کے دو پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ خدا کائنات کا خالق ہے اور اس کی ذات اور صفات مظاہرِ قدرت کے اندرونی نظم اور مقصد میں آشکار ہیں، اور دوسرا یہ کہ انسان سراسر خدا کی محبت کا ایک جذبہ ہے اور یہی جذبہ اس کے تمام اعمال و افعال کی قوتِ محرکہ ہے۔ اگر اس تصور کا یہ دوسرا پہلو بھی صحیح ہے، جیسا کہ درحقیقت صحیح ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تصور کی روشنی کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا ماہرِ فطرتِ انسانی بھی اعمالِ انسانی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اور ان کے معقول اور مدلل اور قابلِ فہم فلسفے (جن کو انسانی اور سماجی علوم کہا جاتا ہے) مدوّن نہیں کر سکتا۔

علوم سے خدا کے تصور کو نکالنے کے نتائج، بعض مغربی مفکرین کا رونا

مغرب کے لوگ چونکہ اپنی تہذیب کے حسی صداقت کے بنیادی عقیدہ کے زیرِ اثر اور اس کلیدی تصور کی روشنی کے بغیر اِن علوم کو مدوّن کرتے رہے ہیں، لہٰذا ناکام اور

نامراد رہے ہیں۔لیکن وہ بدقسمتی سے اب بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر وہ ان علوم کی طرف زیادہ توجہ کریں تو وہ اس تصور کی روشنی کے بغیر ان علوم کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی کرسکیں گے۔مغرب کا ایک ماہر نفسیات سکنر (Skinner) لکھتا ہے:

''سائنس کی ترقی غیر متوازن طور پر ہوئی ہے۔آسان مسائل کو پہلے گرفت میں لے لینے کی وجہ سے اس نے بے جان قدرت پر ہمارا تصرف بڑھا دیا ہے' لیکن ان معاشرتی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا جو اس کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئے ہیں..... بے جان قدرت کی سائنس کو ترقی دینے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اس کے اندر فطرتِ انسانی کی سائنس بھی بڑی مقدار میں شامل نہ ہو' کیونکہ اسی صورت میں اس کے حاصلات دانش مندی کے ساتھ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔'' (''سائنس اور انسانی کردار'' سکنر)

مغرب کا ایک اور ماہر نفسیات میکڈوگل اپنی کتاب ''عالمی انتشار'' میں لکھتا ہے:

''فطرتِ انسانی کے بارہ میں ہماری لاعلمی اب تک تمام انسانی اور اجتماعی علوم کی ترقی کے لئے سدِ راہ بنتی رہی ہے اور اب بھی بنی ہوئی ہے۔یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک شدید ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ شاید مکمل تباہی کے شدید خطرہ کا سامنا کر رہی ہے۔ہم علم نفسیات کا' علم اقتصادیات کا' علم سیاسیات کا' علم قانون کا' علم معاشرت کا اور اس کے علاوہ اور بہت سے فرضی علوم کا ذکر کرتے رہتے ہیں' لیکن سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دلکش نام فقط ہمارے علم کے خلاؤں کا اظہار کرتے ہیں۔وہ فقط ان وسیع و عریض غیر آباد صحراؤں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی سیاحت ابھی تک نہیں کی گئی' لیکن یہ صحرا وہ ہیں کہ اگر ہماری تہذیب نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ان کو کسی قاعدہ کے تحت لانا پڑے گا۔

میرا ادّعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے توازن کو بحال کرنے کے لئے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کا علم (منظم کیا ہوا' آراستہ کیا ہوا علم یا سائنسی علم) اس سے بہت زیادہ درکار ہے جو ہمیں اب تک حاصل ہوا ہے۔

لہٰذا یہ ہے وہ ایک ہی طریق کار' جس سے ہم اپنی تہذیب کی موجودہ غیر یقینی اور دن بدن زیادہ خطرناک ہونے والی حالت کا مداوا کر سکتے ہیں۔ہمیں اپنے

انسانی اور اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم کی شکل دینی چاہئے۔

انسانی اور اجتماعی علوم کی بنیاد دریافت کرنے اور ان کے طریق ترتیب و تدوین کو مہیا کرنے کی ضرورت آج اتنی شدید ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی تو پھر عملی نقطۂ نظر سے علاج کیا ہو؟ میں اپنے جواب کو مختصر طور پر پیش کرنے کے لئے یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ایک ڈکٹیٹر ہوتا تو کیا کرتا..... میں ہر ممکن طریق سے اس بات کی کوشش کرتا کہ ہمارے بہترین دماغوں کو طبیعیاتی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم میں تحقیق کے کام پر لگا دیا جائے''۔ (ورلڈ کیاس' صفحات ۹'۵۹'۱۱۲'۱۱۵)

میکڈوگل انسانی اور اجتماعی علوم کو نئے سرے سے لکھ کر مغربی تہذیب کو متوقع زوال سے بچانا چاہتا' کیونکہ وہ یہ اندازہ کر رہا ہے کہ مغربی تہذیب کا زوال کسی نہ کسی طرح ان علوم کی ابتر حالت کے ساتھ متعلق ہے' تاہم اسے معلوم نہیں کہ ان علوم کو کس طرح سے بدلا جائے کہ ان کے ذریعہ سے مغربی تہذیب کا زوال رک جائے۔ لیکن مغرب کا ایک اور نامور مفکر ہمیں بتاتا ہے کہ مغربی تہذیب کے زوال کا سبب یہ ہے کہ اس تہذیب نے غلطی سے اپنا بنیادی عقیدہ یہ قائم کیا کہ صداقت صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہم اپنے حواس سے معلوم کریں' اور اس طرح سے خدا اور روح کے تصورات کو اپنے علوم سے خارج کر دیا' اور یہ تہذیب زوال سے نہیں بچ سکتی جب تک کسی روحانی عقیدہ کو اپنی بنیاد نہ بنائے۔ اس مفکر کا نام پٹی رم سوروکن ہے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کا پروفیسر رہا ہے اور جس کو امریکی رسالہ ''سوشیالوجی اور سوشل ریسرچ'' عہد حاضر کا سب سے بڑا عبقری قرار دیتا ہے۔ سوروکن اپنی کتاب ''ہمارے دَور کا بحران'' میں لکھتا ہے کہ مغربی تہذیب ایک المناک بحران تک پہنچ گئی ہے جو عنقریب اس کی تباہی کا موجب ہوگی اور یہ تباہی دَورِ حاضر کے انسان کے لئے ذلت کا پیغام اپنے ساتھ لائے گی۔ وہ لکھتا ہے کہ مغربی تہذیب کے اس بحران کا سبب یہ ہے کہ:

''وہ اس عقیدہ کی بنا پر وجود میں آئی تھی کہ حقیقی نیکی اور حقیقی صداقت دونوں کلیتًا بیشتر حسی اور مادّی ہیں۔ ہر وہ چیز جو حواسِ خمسہ کی گرفت سے باہر ہے' بطور صداقت کے فرضی ہے' یا تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں یا اگر کوئی وجود ہے تو چونکہ اسے حواسِ خمسہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا' وہ غیر موجود کے حکم میں ہے۔ چونکہ

حقیقی نیکی اور حقیقی صداقت کو مادّی یا حسی قرار دے لیا گیا تھا' نہ ہر وہ چیز جو حواس کے حدِ ادراک سے ماوراء تھی' خواہ وہ خدا کا تصور تھی یا انسان کا شعور' ہر وہ چیز جو غیر حسی یا غیر مادی تھی اور جو روزمرہ کے تجربہ میں دیکھی' سنی' چھوئی یا سونگھی نہیں جا سکتی' ضروری تھا کہ اسے غیر حقیقی' غیر موجود اور بے سود قرار دیا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس شجر کاری کا پہلا زہر آلود پھل یہ تھا کہ حقیقی نیکی اور حقیقی صداقت کا دائرہ مہلک حد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اور جب تہذیب ایک بار اس راستہ پر چل نکلی تو پھر اس کو اسی راستہ پر آگے جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صداقت اور نیکی کی دنیا ہر روز اور زیادہ حسیت اور مادیت کے تنگ سانچوں میں ڈھلتی گئی''۔

سوروکن آخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دورِ حاضر کی حسیت زدہ تہذیب کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ اپنے حسیت نواز بنیادی عقیدہ کو بدل کر اس کی جگہ کسی روحانی عقیدہ (یعنی خدا) کو اپنی بنیاد بنائے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ اس ''حسیت زدہ تہذیب کے تمام مفروضات اور تمام اقدار کا نئے سرے سے گہرا مطالعہ کیا جائے' اس کی بوسیدہ اور بے کار اقدار کو رد کیا جائے اور ان سچی قدروں کو بحال کیا جائے جنہیں انسانیت نے پس پشت ڈال رکھا تھا..... مذہب اور سائنس کا موجودہ افتراق حد درجہ تباہ کن ہی نہیں' بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر حقیقی صداقت اور حقیقی نیکی کے معقول اور تسلی بخش نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ قادرِ مطلق خدا کی صفات کو اس مرئی دنیا کے اندر آشکار کیا جائے' تاکہ خدا کے نام کا بول بالا ہو اور انسان کی عظمت پایۂ ثبوت کو پہنچے۔'' (ماہانہ اسلامی تعلیم' مئی' جون ۱۹۷۲ء)

علوم کی از سرِ نو تدوین کا مسئلہ اور ہماری ذمہ داریاں

(۱) قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیا ہمارے لئے مناسب ہے کہ مغرب کے ان انسانی اجتماعی علوم کو اپنی یونیورسٹیوں میں پڑھائیں' جن کو خود مغرب کے لوگ علوم کا

درجہ نہیں دیتے اور ان کو بدلنا چاہتے ہیں' تا کہ ان کی تہذیب تباہی سے بچ جائے؟ کیا ان علوم کو اپنا کر ہم خود بربادی کی راہوں پر نہیں چلیں گے؟ ہمیں چاہئے کہ ہم اس زہر سے پرہیز کریں جس سے مغربی تہذیب مر رہی ہے اور مغرب کے حسی صداقت کے عقیدہ کو رد کر کے تمام طبیعیاتی' حیاتیاتی اور انسانی علوم کو نئے سرے سے اس طرح سے مدوّن کریں کہ خدا کا عقیدہ ان کا مرکز و محور بن جائے۔ ان علوم کی نصابی کتابوں میں خدا کے عقیدہ کو اپنے مقام پر لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مغرب میں ایسا نہیں کیا گیا۔ لیکن اب مغرب کے لوگ منتظر ہیں کہ ایسا کیا جائے' لہٰذا اب یہ رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی۔ مغرب کا ایک نامور فلسفی فیلڈ مارشل سمٹس جس نے ہولزم کے نام سے فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب لکھی ہے' کہتا ہے:

''یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ سائنس ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شاید خدا کی ہستی کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ یقیناً مستقبل میں نوع انسانی کے لئے کرنے کے بڑے بڑے کاموں میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ وابستہ کر لے اور اس طرح اس مہیب خطرے کا سدباب کرے جو ہماری تہذیب کے مستقبل کو درپیش ہے۔''

(۲) اسلامی نظامِ تعلیم میں اسلامیات کا مضمون الگ بھی پڑھانا ضروری ہے' لیکن ہمیں چاہئے کہ ہم اس مضمون کی نصابی کتابوں کو اس طرح سے تیار کریں کہ وہ تمام اسلامی احکام کی (جن میں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ بھی شامل ہیں) اور اسلامی ضابطۂ اخلاق کی دل نشیں وضاحت کرنے کے علاوہ اسلام کو ایک نظریۂ کائنات کے طور پر اس طرح سے پیش کریں کہ زمانۂ حال کا انسان جو ہر اعتقاد اور عمل کی عقلی اور علمی توجیہہ چاہتا ہے' اس سے پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ اسلامیات کے طالب علم کے لئے اس زمانہ میں ان دو سوالات کا تسلی بخش جواب معلوم کرنا حد درجہ ضروری ہے:

۱۔ انسان کو مذہب کی ضرورت کیوں ہے؟

۲۔ صرف اسلام ہی وہ مذہب کیوں ہے جو انسان کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے؟

خدا کا شکر ہے کہ اب اسلام کا فلسفہ ہمارے پاس اس شکل میں موجود ہے کہ ہم اس

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

امام عبداللہ بن وہبؒ

(۱۲۴ھ — ۱۹۷ھ)

عبدالرشید عراقی

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں جن حضرات نے مشرق و مغرب میں اُن کے فقہی مسلک کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں امام عبداللہ بن وہب سرفہرست ہیں۔

امام عبداللہ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے دَور میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ تمام علومِ اسلامیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ حدیثِ نبوی ﷺ پر اُن کو عبورِ کامل تھا اور حدیثِ نبوی سے مسائل کے اجتہاد اور استنباط میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اس لئے علمائے اسلام نے ان کو جلیل القدر محدث کے ساتھ مجتہد بھی لکھا ہے۔ (۱) علم حدیث میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس لئے اربابِ سیر نے ان کی عدالت و ثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو ثقہ کہا ہے۔ مؤرخ ابن خلکان لکھتے ہیں:

کان احد ائمة عصرہ ''اپنے زمانہ کے ائمہ میں سے تھے۔'' (۲)

حافظ ذہبی نے ''احد الائمة الاعلام'' لکھا ہے۔ (۳)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن وہب اپنے زمانے میں حجت تھے۔ تمام لوگ ان کی مرویات پر کمال وثوق اور اعتماد رکھتے تھے۔ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے' بلکہ خود مجتہد تھے' البتہ طریقہ اجتہاد و تفقہ میں وہ امام مالک اور لیث بن سعد کا اتباع کرتے تھے۔'' (۴)

امام عبداللہ بن وہب ۱۲۴ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ قریش کی شاخ بنو فہر کے غلام تھے۔ (۵)

۱۷ سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔

اساتذہ

ابن وہب نے جن نامور محدثین کرام سے اکتساب فیض کیا ان میں سے چند ایک مشہور اساتذہ یہ ہیں:

امام مالک بن انس، یونس بن زید، ابن جریج، حیوۃ بن شریح، لیث بن سعد اور امام سفیان بن عیینہ (۶)

تلامذہ

جن ائمہ کرام اور محدثین نے ابن وہب سے استفادہ کیا ان میں سے مشہور یہ ہیں: عبدالرحمٰن بن مہدی، یونس بن عبدالاعلیٰ، ربیع بن سلیمان اور احمد بن صالح وغیرہ۔ (۷)

جامعیت

امام عبداللہ بن وہب نے سب سے زیادہ اکتساب فیض امام مالک سے کیا۔ ان کی خدمت میں ۲۰ سال گزارے اور حدیث کی تحصیل کے ساتھ فقہ میں بھی استفادہ کیا۔ اس لئے ابن وہب کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ حدیث اور فقہ میں جامع الکمالات تھے۔ ان کے تلمیذ رشید یونس بن عبدالاعلیٰ فرماتے ہیں:

''ابن وہب حدیث، فقہ اور عبادات تینوں کے جامع تھے''۔ (۸)

امام مالکؒ سے تحصیل علم کے بعد جب ابن وہب اپنے وطن مصر چلے گئے اور درس وتدریس اور تعلیم وتعلم میں مصروف ہوئے تو امام مالک سے ان کا تعلق خط وکتابت کے ذریعہ قائم رہا۔

امام مالکؒ ان کے تبحر علمی کے معترف تھے اور جب ان کو خط لکھتے تو خط کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی:

" الی عبداللّٰہ بن وھب فقیہ مصر ای مفتی مصر " لیکن ابن وہب از راہِ ورع واحتیاط فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے۔ (۹)

عہدۂ قضاء سے انکار

ابن وہب کے علم وفضل اور اُن کی شہرت ومقبولیت سے حکومت وقت باخبر تھی۔ اس لئے والیٔ مصر عباد بن محمد نے ان کو عہدۂ قضا پیش کیا' مگر آپ نے معذرت کی۔ اس نے جب زیادہ دباؤ ڈالا تو آپ غائب ہو گئے۔ والیٔ مصر نے غصہ میں آ کر آپ کا گھر جلا دیا' مگر اس کے باوجود بھی آپ نے عہدۂ قضاء کو قبول نہ کیا۔ (۱۰)

سیرت وکردار

سیرت وکردار اور اخلاق وعادات کے لحاظ سے ابن وہب بلند مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔ بہت زیادہ عبادت گزار تھے۔ خشیت الٰہی کا اُن پر بہت زیادہ غلبہ تھا۔ قیامت کی ہولناکیاں یاد کر کے ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور بسا اوقات ان کو غش آ جاتا۔

میدانِ جہاد کی پُرشور زندگی علم وفن کی پُرسکون زندگی کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے' مگر تبع تابعین میں امام ابن مبارک اور امام ابن وہب ان دونوں اوصاف کے جامع تھے۔ ابن وہب نے پورے سال کو تین کاموں میں تقسیم کر دیا تھا:

چار ماہ درس وتدریس کے لئے　　چار ماہ سفر حج کے لئے

چار ماہ باطل کو سرنگوں اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کے لئے۔ (۱۱)

تصنیف

ابن خلکان لکھتے ہیں:

وله مصنفات فی الفقه معروفة

''علم فقہ میں ان کی تصانیف معروف ومشہور ہیں۔'' (۱۲)

وفات

امام ابن وہب نے شعبان ۱۹۷ھ میں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ امام

سفیان بن عیینہ کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو فرمایا:

"انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔ یہ عامۃ المسلمین اور خواص اہلِ علم دونوں کا حادثہ ہے"۔(۱۳)

حواشی

۱) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ' ۱/۳۷۸
۲) ابنِ خلکان: تاریخ ابنِ خلکان' ۱/۲۴۹
۳) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ' ۱/۳۷۸
۴) شاہ عبدالعزیز دہلوی: بستان المحدثین' ص۱۲
۵) ابنِ خلکان: تاریخ ابنِ خلکان' ۱/۲۴۱
۶) ابنِ حجر: تہذیب التہذیب' ۶/۷۴
۷) ابنِ حجر: تہذیب التہذیب' ۶/۷۴
۸) ابنِ حجر: تہذیب التہذیب' ۶/۷۴
۹) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ' ۱۱/۲۸۰
۱۰) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ' ۱/۲۸۰
۱۱) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ' ۱/۲۸۰
۱۲) ابنِ خلکان: تاریخ ابنِ خلکان' ۱/۲۴۲
۱۳) ابنِ حجر: تہذیب التہذیب' ۶/۷۴

بقیہ: فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ

کی روشنی میں اسلامیات کی اس قسم کی کتابوں میں اسلام کو ایک عقلی اور علمی نظریہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان دو سوالوں کا نہایت ہی تسلی بخش جواب دے سکتے ہیں۔

(۳) اگر ہم نے اسلامی تعلیم کو ملک کے اتحاد کا ایک ذریعہ بنانا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم لفظ تعلیم کے مفہوم کو وسعت دے کر اس میں نہ صرف یونیورسٹی' کالج اور سکول کی تعلیم کو بلکہ اس تعلیم کو بھی شامل کریں جو اور ذرائع سے انسان اور کائنات کے متعلق پاکستانی فرد کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان ذرائع میں مطبوعات (اخبارات' رسائل اور کتابیں) خواہ وہ ملک کے اندر تیار کی گئی ہوں یا باہر سے آئی ہوں' اور پبلک جلسوں میں ہونے والی تقریریں' اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام اور غیر ملکی یا ملکی فلمیں شامل ہیں۔ اگر ہم ان ذرائع تعلیم کو اسلام کی واقفیت اور محبت پیدا کرنے کے لئے استعمال نہ کریں گے تو وہ کسی نہ کسی رنگ میں لازماً اس مقصد کے خلاف معرضِ عمل میں آئیں گے اور قومی اتحاد پیدا کرنے کی اس کوشش کو بہت حد تک کالعدم کر دیں گے جو یونیورسٹی' کالج اور سکول کی طرف سے ہو رہی ہوگی۔ (ایضاً)

(جاری ہے)

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : اہل کفر کے ساتھ تعلقات ـــــ وفاداری یا بیزاری؟

مصنف : ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

ضخامت : 332 صفحات قیمت : 150 روپے

ناشر : نور اسلام اکیڈمی' پوسٹ بکس 5166 ماڈل ٹاؤن لاہور

ملنے کا پتہ : مکتبہ نور اسلام' رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور

اسلام دین کامل ہے اور ایک مسلمان کے لئے ہر شعبۂ زندگی میں یہ واضح راہنمائی دیتا ہے۔ اس کتاب میں موضوع بحث یہ ہے کہ مسلمان اہل کفر و شرک کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھیں۔ حسن اخلاق تو ہر مسلمان پر لازم ہے' مگر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دشمن خدا و رسول اور اعدائے دینِ حق کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ دوستی اور ولایت کا نہیں ہوسکتا۔ رواداری بالکل اور شے ہے۔ یہ احترامِ آدمیت ہے جو اسلامی اخلاق کا ایک اہم پہلو ہے' مگر باطل کے ساتھ مفاہمت' باطل کی نقالی' باطل کے ساتھ قلبی دوستی اور شیر و شکر ہونے کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ اس موضوع کو فاضل مصنف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں خوب مبرہن کیا ہے اور اس سلسلہ میں مُداہنت کی ہر گنجائش پر بھرپور گرفت کی ہے۔

عصر حاضر کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ ''نظریۂ وحدتِ ادیان'' ہے جس کا اس کتاب میں مدلل ابطال کیا گیا ہے۔ وحدتِ ادیان کا نظریہ یہ ہے کہ آخرت کی نجات کسی ایک مذہب کی پیروی میں منحصر نہیں ہے' بلکہ تمام مذاہب کے چیدہ چیدہ عقائد کو جمع

کر دینا چاہئے اور یہ عقائد ہر شخص کے لئے قابل قبول ہوں' حالانکہ یہ سراسر گمراہی ہے' کیونکہ حق تو صرف دین اسلام ہے جو اللہ نے انسانوں کے لئے پسند کیا ہے' اسی میں دین و دنیا کی تمام کامیابیاں ہیں۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ دوسروں کا خیر خواہ ہو' لہٰذا وہ غیر مسلموں کے سامنے دین حق پیش کر کے ان کی خیر خواہی کرے گا۔ اگر وہ حق کو قبول کر لیں تو فبہا' ورنہ ان کے لئے وہ وفاداری نہیں بلکہ بیزاری کا جذبہ رکھے گا۔

مصنف نے زیر بحث مسئلے کے ہر پہلو پر ماہرانہ روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان صرف مسلمان کا وفادار ہے' کافر کے کفر کے ساتھ اس کی بیزاری ہی اس کے ایمان کی صحت کی علامت ہے۔ مسئلے کی وضاحت کے لئے کتاب کو چھ مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر بحث بڑی حد تک جامع اور سیر حاصل ہے' کیونکہ تمام دلائل کتاب وسنت سے لئے گئے ہیں۔

یہ کتاب مسلمانوں کے اندر اس موضوع کے سلسلہ میں پائی جانے والی تمام غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لئے کافی ہے۔

نور اسلام اکیڈمی ٹھوس دینی تعلیمات پر مبنی کتابیں شائع کرنے والا نیک نام ادارہ ہے۔ یہ کتاب بھی اس کے حسنِ ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خوبصورت ٹائٹل' مضبوط جلد اور سفید کاغذ پر طبع شدہ یہ کتاب حسنِ ظاہری سے بھی مزین ہے۔ رعایتی قیمت پر یہ کتاب 120 روپے (مع ڈاک خرچ) ارسال کر کے منگوائی جا سکتی ہے۔

(۲)

نام کتاب : تذکرہ وسوانح الحاج مولانا محمد احمد صاحب

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت : 176 صفحات قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ : القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد' ضلع نوشہرہ' سرحد' پاکستان

اہل اللہ کے حالات کا جاننا خصوصی تاثیر رکھتا ہے۔ اسی لئے داناؤں کا قول ہے کہ

بڑے لوگوں کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی قول کا مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالقیوم حقانی کو سوانح نگاری کی خصوصی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ ان کا قلم توازن و اعتدال کا خوبصورت نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ عقیدت کے جذبات سے مغلوب ہوکر افراط وتفریط سے کام نہیں لیتے بلکہ صرف حق بیانی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

مولانا محمد احمد نے کالج سے تعلیم پائی اور اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے۔ ٦٠ سال کی عمر میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے طور پر ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور ہمہ تن اصلاح وتبلیغ کے کام میں لگ گئے۔ اگرچہ آپ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ تھے مگر اکابر علماء اور صلحائے اُمت کی صحبت کے فیض نے آپ کو بڑے لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ جیسے بزرگوں سے آپ نے کسب فیض کیا اور قرآن وحدیث کا فہم اس حد تک حاصل کرلیا کہ ایک بلند پایہ تفسیر ''درسِ قرآن'' کے نام سے لکھی۔ یہ تفسیر گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے اور اکابر علماء نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

مولانا عبدالقیوم حقانی نے اس کتاب میں مولانا محمد احمد کی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں کئے ہیں جو قارئین کے لئے سبق آموز ہیں۔ مولانا نے ٩١ سال کی عمر میں ١٩٩٩ء میں رحلت فرمائی اور آخر دم تک انتہائی کمزوری کے باوجود دعوت وتبلیغ کے کام میں مصروف رہے۔ مولانا محمد احمد صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ اتباعِ سنت اور دین پر استقامت آپ کے سیرت وکردار میں نمایاں تھی۔ کتاب اللہ کے ساتھ آپ کے گہرے شغف کا اندازہ تو آپ کی ضخیم تفسیر ''درسِ قرآن'' سے لگایا جاسکتا ہے۔

خوبصورت اور مضبوط جلد میں محفوظ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ یہ کتاب القاسم اکیڈمی کی مطبوعات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

(۳)

نام کتاب : جمالِ یوسف
مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی
ضخامت : 304 صفحات
قیمت : درج نہیں
ملنے کا پتہ : القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد نوشہرہ

''جمالِ یوسف'' معروف عالم دین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ مولانا موصوف کی زندگی اسلامی تعلیمات کا مرقع تھی۔ وہ بنیادی طور پر تو عالم دین تھے مگر ایک جامع شخصیت ہونے کے ناطے وہ ایک اچھے قائد، خوش بیان واعظ، پُر جوش خطیب، صاحب طرز ادیب، ماہر استاذ، شاعر اور صاحب فراست سیاست دان تھے۔ انہیں دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء سے کسب فیض کا موقع ملا جن میں علامہ انور شاہ کاشمیری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا عبدالرحمٰن امروہی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے اعاظم رجال شامل ہیں۔

مشاہیر کی زندگیوں کا مطالعہ قارئین میں جذبۂ فکر و عمل پیدا کرتا ہے۔ اس لئے بڑے لوگوں کے سوانح حیات کو قلمبند کرنا اور عوام الناس تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہوتا ہے۔ اس جذبے کے تحت فاضل مصنف نے مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے سوانح ''جمالِ یوسف'' کے نام سے شائع کئے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا موصوف کی زندگی کے مختلف گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو قارئین کے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اقتباسات ہیں جو مختلف لوگوں نے ان کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔ مولانا نے آزمائش کے مختلف دور دیکھے اور ہر دفعہ صبر و استقامت کا پہاڑ ثابت ہوئے۔ تحریک ختم نبوت کے قائد کی حیثیت سے جرأت اور ہمت کی مثال قائم کی۔

ٹائٹل دیدہ زیب اور جلد مضبوط ہے۔ کمپوزنگ کی چند ایک اغلاط ہیں جن کی درستگی ضروری ہے۔

(۴)

نام کتاب : ISABELLA

مصنف : مفتی اقتدار احمد خان

مترجم : پروفیسر مظہر علی ادیب

ضخامت : 270 صفحات

قیمت : 125 روپے

ملنے کا پتہ : نعیمی کتب خانہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات

مصنف کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف مفتی احمد یار خان کے صاحبزادے ہیں جو ممتاز عالمِ دین اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب مصنف نے نصح اور خیر خواہی کے جذبے سے لکھی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت عیسائی مشنریاں پاکستان کے مختلف علاقوں میں سرگرمی کے ساتھ مصروفِ عمل تھیں اور طرح طرح کے لالچ دے کر مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کر رہی تھیں۔ مفتی صاحب نے عیسائیت کے ردّ میں بہت سا مواد اکٹھا کیا۔ عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور دس سوالوں پر مشتمل ایک پمفلٹ تیار کر کے مختلف عیسائی عالموں کے پاس بھیجا کہ اس کا جواب دیں، مگر کسی طرف سے جواب نہ آیا۔ مصنف نے ایک عیسائی پادری سلطان پال کی ایک کتاب دیکھی جس میں اس نے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ بیان کی تھی۔ اس میں دیئے گئے دلائل کی کمزوری انتہائی عیاں تھی۔ اسی دوران سیّد معصوم شاہ صاحب نے مفتی صاحب کو ٹھوس دلائل پر مبنی ردِّ عیسائیت پر کتاب لکھنے کی تلقین کی جس میں اسلام کی حقانیت، جامعیت اور سچائی واضح کی جائے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے اس کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجہ میں یہ تصنیف معرضِ وجود میں آئی۔ بعد ازاں اس کتاب کی افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے پروفیسر مظہر علی ادیب سے اس کا ترجمہ بزبان انگریزی کروایا گیا جو اس وقت زیرِ تبصرہ ہے۔

کتاب ناول کے انداز میں لکھی گئی ہے جس میں ایک نوعمر عیسائی طالبہ آئسا بیلا' مشہور عیسائی پادری کی بیٹی' عیسائیت میں دلچسپی رکھتی ہے' مگر اتفاقاً چند مسلمان لڑکوں کی اسلام کے متعلق گفتگو سن کر اِس کے متعلق واقفیت حاصل کرتی ہے اور اس حد تک متاثر ہوتی ہے کہ اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ ماں باپ ناراض ہوتے ہیں تو انہیں دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر اسے دوسرے پادریوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ انہیں بھی لاجواب کر دیتی ہے۔ تبدیلیٔ مذہب کے نتیجہ میں اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اعصاب شکن حالات اسے درپیش آتے ہیں مگر یہ سب کچھ اس کے آہنی ارادے کو متزلزل نہ کر سکا' بلکہ اُس کے اِس عزم بالجزم سے متاثر ہو کر بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی دینِ حق قبول کرنے کی توفیق ہوئی۔

مسلمان اس کتاب کا مطالعہ کر کے اسلام کے ساتھ وابستگی میں مزید مضبوطی اختیار کریں گے جبکہ غیر مسلم اگر صاف دل کے ساتھ پڑھیں گے تو ان پر اسلام کی حقانیت واضح ہو جائے گی۔ عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے اس میں کافی مواد موجود ہے۔

داعی و مؤسس تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کی نئی کتاب

ختم نبوت کے دو مفہوم

اور

تکمیل رسالت کے عملی تقاضے

شائع ہوگئی ہے۔ کل صفحات 48 ' قیمت 12 روپے

ملنے کا پتہ: قرآن اکیڈمی 36- کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501

بقیہ : حرفِ اوّل

مترادف الفاظ سمجھے جانے لگے۔ تعلیم کا مقصد اور معیار یہ قرار پایا کہ ایک طالب علم انگریزی زبان بولنے' لکھنے اور سمجھنے لگے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سرکاری سکولوں کالجوں سمیت ملک کے قریباً تمام متوسط درجے کی درس گاہوں میں معیارِ تعلیم اتنا ناقص ہے کہ 12 سے 14 سال مسلسل انگریزی پڑھتے رہنے کے باوجود بھی طلبہ کی غالب اکثریت انگریزی زبان کے رموز اور اسالیب سے قطعی نابلد اور نا آشنا رہتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بی اے میں طلبہ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی ''انگریزی شریف'' ہے۔ یہ وہ ہفت خواں ہے جو کسی طور عبور ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ بی اے کی سطح پر جس اعلیٰ سطح کی لٹریری انگریزی شاملِ نصاب کی گئی ہے اس کا حق ادا کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسانی طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ غیر ملکی زبان کو اتنی گہرائی میں جا کر اور باریکی کے ساتھ سیکھنا ہر انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا —— یہ درست ہے کہ انگریزی زبان ایک نہایت اہم بین الاقوامی زبان ہے —— آپ اسے اگر دنیا کی تمام زبانوں پر فوقیت دینا چاہیں تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہونا چاہئے کہ فنکشنل انگریزی (Functional English) کی حد تک اسے میٹرک یا ایف اے تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے —— ہاں جو شخص انگریزی زبان ہی کو اپنا مرکزی subject اور اس کی تدریس کو اپنا کیریئر بنانا چاہے تو وہ بی اے اور ایم اے میں لٹریری انگریزی پڑھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے طلبہ و طالبات کے اوقات اور صلاحیتوں کا جس بڑے پیمانے پر ضیاع ہمارے اس ناقص نظامِ تعلیم اور بالخصوص انگریزی کے لزوم کے باعث ہوتا ہے اس کا اگر شمار کیا جائے تو کہے صنم بھی ہری ہری! تعلیمی میدان میں پالیسی بنانے والے سرکردہ افراد کی چند لمحات پر مشتمل خطاؤں کی سزا یہ قوم نصف صدی سے بھگتتی چلی آ رہی ہے۔

ہم عربی بورڈ آف سٹڈیز کی ان سفارشات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ گریجویشن کی سطح پر ''انگریزی زبان'' کے لزوم کو ختم کیا جائے۔ پہلی جماعت سے ایف اے تک انگریزی زبان کو بطور لازمی مضمون پڑھنا بہت کافی ہے۔ بی اے میں طلبہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یو این او کی تسلیم شدہ چھ زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو آپشنل مضمون کے طور پر پڑھیں —— بلکہ سچ پوچھئے تو ہماری رائے میں جو مقام اس مملکت خداداد پاکستان میں انگریزی زبان کو اب تک دیا گیا ہے' یہ مقام عربی زبان کو دیا جانا چاہئے تھا —— ''اسلام تیرا دیس ہے' تو مصطفوی ہے'' کے مصداق ہماری ترجیح اول اسلام ہے۔ اس حوالے سے اہم ترین زبان ہمارے نزدیک عربی ہے۔ یہ قرآن و حدیث کی زبان تو ہے ہی' عالمی سطح پر بھی دنیا کی تسلیم شدہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ oo